بدنام گلیاں

انتصار حسین

اودھ کتاب گھر

پوسٹ بکس ۴۴ کچہری روڈ کراچی ۱

(ادبی پریس کراچی)

قیمت

پاکستانی سکہ - ایک روپیہ آٹھ آنے

ہندوستانی سکہ - دو روپیہ

باراوّل

جنوری ۵۲ء

فہرست

بند دروازے

پکھراج نے نیلم کو اپنے حاصل شدہ تجربے سے پالا۔ کوئی بری راہ نہیں چلنے دی۔ اوباش لڑکوں کی صحبت میں نہیں بیٹھنے دیا مگر نیلم فطرتاً شوخ تھی اور ماں کی دیکھ بھال اور تاکید کے باوجود خود جوان لڑکوں کو دیکھ کر ہنس پڑتی۔ نیلم نے اب اُس منزل میں قدم رکھا تھا جہاں پکھراج کے قدم ڈگمگائے تھے اور اُس نے ٹھوکریں کھائی تھیں، اور اسی لئے وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے اس راستے پر وہ نیلم کو اُنگلی پکڑ کر لے جائے۔ اور کوئی ٹھوکر نہ کھانے دے۔

نیلم۔ پکھراج۔ اور ان کی بہت سی ماں بہنیں۔ زمرد۔ فیروزہ اور یاقوت اگر کسی انگشتری کا رنگ نہیں ہیں تو وہ انسانی ٹھوکریں ہیں، رئیسوں اور نوابوں کے گھروں میں خادمائیں کسی قیمتی پتھر کے نام سے منسوب ہو کر جاروب کشی کرتی ہیں۔ برتن مانجھتی ہیں فرشی پنکھا جھلتی ہیں۔ دن بھر اِدھر سے اُدھر دوڑتی پھرتی ہیں اور ٹھوکریں کھاتی ہیں۔

کشور آرا بیگم نے اپنی **منجھلی** سے نیلم کو آواز دی۔ وہ ماں کے پاس سے

آدھا دوپٹہ گلے میں بے ترتیبی کے ساتھ ڈال کر بھاگی۔

قمر نواب سے وقت تو پوچھ آ!"

وہ اُلٹے پاؤں بالاخانہ کی طرف مڑی ہی تھی کہ پکھراج نے ایک ڈانٹ بتائی ذرا دوپٹہ تو اوڑھ سلیقے سے۔ سینے پر دُھرا آنچل ڈال، اتنی بڑی ہوگئی مگر کسی طرح دیدے کان نہیں ہوتے۔ اور نیلم بلا کسی جواب کے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی زینے پر چڑھ گئی۔

بالاخانے کی تیسری منزل پر قمر کا کمرہ تھا۔ وہ ان دنوں گرمیوں کی تعطیل میں اپنے گھر آیا ہوا تھا اور کسی نامعلوم عقیدت کی بنا پر نواب صاحب نے قمر کو تنہائی پسند سمجھ کر اس کے لئے سب سے اوپر والی منزل پر ایک کمرہ انگریزی طریقہ پر آراستہ کروایا تھا۔ ایک سال پہلے قمر اپنی گرمیوں کی تعطیل گھر پر گزار کر گیا تھا تو یہ تکلفات نہیں برتے گئے تھے۔ اس وقت نیلم پر اتنی پابندیاں اور سختیاں بھی نہ تھیں اور نہ دوپٹہ اسقدر بے ترتیبی کے ساتھ اوڑھنے پر وہ چیخی چلائی جاتی تھی۔ قمر کی بابت اس وقت یہ نہیں سمجھا گیا تھا کہ انگریزی پڑھ کر لڑکے تنہائی پسند ہو جاتے ہیں ایک سال پہلے قمر نیلم کو ڈانٹ کر اپنے کمرے سے بھگا دیا کرتا تھا۔ پکھراج سے کہتا تھا "تمھاری لڑکی کس قدر بدتمیز ہے میری کتابوں کو تصویروں کی لالچ میں الٹا پلٹا کرتی ہے۔" اور پکھراج یہ کہکر ٹال دیا کرتی تھی "ابھی بچہ ہے۔ کبھی اس کے لئے کوئی چیز ہی لے کر آیا کرو۔ نہ جانے کب سے تمھارے آنے کا ایک ایک دن گنتی ہے۔" اور قمر پکھراج کے اس جواب پر جیسے چڑھ جاتا۔

ہوں۔ بڑی بچہ ہے۔ خبردار جو اِس نے آئندہ سے میرے کمرے میں قدم رکھا

مگر اب؟ وہ ایک سال پہلے والی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ نیلم کی آہٹ پر قمر ایک انگڑائی لیکر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ دیوار پر لگی ہوئی کلاک نے اُس وقت ٹن ٹن کر کے بارہ ۱۲ بجائے۔ تیسری منزل کے اس خاموش کمرے میں آواز گونجی۔ جب پورے بارہ بج لیئے تو نیلم نے کہا۔ "بیگم صاحبہ وقت پوچھ رہی ہیں۔"

"بارہ"

"مگر میرے سامنے تو آٹھ ہی دفعہ ٹن ٹن ہوا؟"

"چار ٹن ٹن تمھارے آنے سے پہلے ہو چکے ہیں۔"

نیلم جانے لگی تو قمر نے روک کر کہا۔ "تو گھڑی دیکھنا سیکھ کیوں نہیں لیتی، آ اِدھر آ میرے قریب"۔

اور نیلم قمر کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

"یہ دیکھ! دو سوئیاں ہیں ایک چھوٹی ایک بڑی"۔

"جی۔ جی ہاں"

"بڑی سوئی تیز چلتی ہے اور چھوٹی سوئی سُست چلتی ہے۔ یہ منٹ بتلاتی ہے اور یہ گھنٹہ ..... یہ دیکھ اتنی دیر میں بڑی سوئی آگے کھسک گئی مگر چھوٹی سوئی وہیں پر ہے۔ اچھا بتا اب کیا بجا ہے۔"

"بارہ!"

دیوانی! بارہ بج کے ایک منٹ گزر گیا"

"سمجھی؟"

"نہیں"۔

"نہیں۔ اچھا یوں سمجھو۔ ہم تم دو سوئیاں ہیں۔ ہم بڑی تم چھوٹی ہم دونوں ایک ہی مقام سے ایک ساتھ چلتے ہیں۔ ہم آگے بھاگ جاتے ہیں اور تم پیچھے رہ جاتی ہو مگر پھر ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں اُسی مقام پر جہاں سے ہم چلے تھے۔ اور اس وقت بارہ بجتے ہیں۔"

اور اُس وقت بارہ بجے تھے، گھڑی کی دونوں سوئیاں پاس ہی پاس تھیں۔ نیلم اور قمر ایک دوسرے کے قریب کھڑے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک سال پہلے قمر بھرا ج سے نیلم کی شکایتیں کرتا تھا اُسے ڈانٹ کر اپنے کمرے سے بھگا دیتا تھا۔ اور اب کچھ نہیں کہتا تیسری منزل کے خاموش کمرے میں بیٹھا ہوا نیلم کا راستہ دیکھا کرتا ہے کہ وہ کب وقت پوچھنے آئے اور میں اُسے بتاؤں کہ بارہ بج گئے۔

بچپن سے ایک ساتھ دونوں ایک مقام سے چلے تھے۔ اسکول۔ گراونڈ ہیج۔ شرارتیں۔ پکنگ۔ رومانس۔ کالج۔ یہ ساری مسافت طے کرنے کے بعد پھر وہی تیسری منزل کا کمرہ، جہاں آکر پھر یہ دونوں ملے۔ زندگی کی گھڑی میں بارہ بج گئے ۔۔۔ پھر جیسے اس نے نیلم کے کان میں چپکے سے کہا "بارہ بج گئے۔ بارہ کبھی بے کہنا نہیں۔"

اور جیسے نیلم ہنس کر شرما سی گئی۔ اُس کی کان کی لَویں سرخ ہوگئیں۔ بارہ بج گئے۔ کوئی سُن لے گا تو کیا کہے گا۔

اتنی دیر میں نیچے سے کسی نے آواز دی نیلم۔ اے نیلم۔ حرافہ کہیں کی اوپر ہی جاکر دفن ہوگئی۔ کتنی دیر ہوئی جب قمر نواب کے پاس وقت پوچھنے بھیجی تھا۔ بیٹھی

اٹھکھیلیاں کر رہی ہو گی "

" خدا ہی حافظ ہے پکھراج تمھاری لڑکی کا - اچھے اُٹھان اُٹھا رہی ہو سب کچھ سمجھتے بوجھتے ہوئے بھی لڑکی کو ایسا ڈھیٹ کر رکھا ہے " اور پکھراج کو اپنا وہ زمانہ یاد آگیا - اب سے تقریباً ۱۸ - ۲۰ سال پہلے جب نواب صاحب کی شادی ہوئی تھی وہ اُن سے اٹھکھیلیاں کرتی تھی -

وہ سب جانتی بوجھتی تھی وہ نیلم کو زندگی کے اُس راستے پر انگلی پکڑ کر لے جانا چاہتی تھی - مگر گھڑی کی یہ دونوں چھوٹی بڑی سوئیاں - ایک مقام - دوڑ بھاگ - اور سب سے زیادہ اس نگینے کا مقناطیس وہ انسانی ٹھوکر جس کے لئے نیلم پیدا کی گئی تھی، پکھراج نے کشور آرا بیگم کو کوئی جواب نہیں دیا - نیلم بالاخانہ سے اُتری تو کچھ کھوئی کھوئی سی - ماتھے پر پسینہ کی بوندیں اور گال پہلے سے زیادہ سرخ -

" کیا کر رہی تھی وہاں؟ وقت ٹٹول رہی تھی کیا؟ چڑیل کہیں کی "؟

" قمر نواب چوکی پر تھے - ان کا انتظار کر رہی تھی - بارہ بجے ہیں! "

" اور صورت پر بھی تو بارہ بج رہے ہیں پکھراج دیکھ رہی ہو صاحبزادی کی صورت؟ کان کی لووں سے لہو ٹپکنے ہی والا ہے "

اور پکھراج نیلم کو الگ لے جا کر دھاننے لگی " ماں زادی - تجھے سنکھیا دے دوں گی ایک دن اگر تو نے میرا کہنا نہ مانا - بتا کیا کر رہی تھی وہاں، اتنی دیر کیوں لگائی؟ "

" قمر نواب وقت دیکھنا سکھا رہے تھے " ماں کے پاس پہنچ کر وہ پھر اپنی اصلی حالت پر آگئی - کہنے لگی " تم اتنی بڑی ہو گئیں مگر تم گھڑی دیکھ کر وقت نہیں بتلا سکتی ہو - مجھے قمر نواب نے سب کچھ سکھا دیا - اب جب کوئی وقت پوچھے گا تو میں خود ہی گھڑی دیکھ کر

بتادیا کروں گی ـــــ دو سوئیاں ہوتی ہیں اماں ایک بڑی اور ایک چھوٹی۔ بڑی سوئی تیز چلتی ہے۔ چھوٹی سوئی سست چلتی ہے۔ ایک گھنٹہ بتلاتی ہے اور ایک منٹ"

"اچھا پھر؟ پکھراج نے نیلم کے مرض کو لاعلاج سمجھ کر پوچھا۔ پھر کیا۔

یوں سمجھ لو کہ میں چھوٹی سوئی ہوں اور قمر نواب بڑی سوئی اس گھر میں پیدا ہوئے بڑے ہوئے۔ اور پھر وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں نکال کر کچھ سوچنے لگی۔

پکھراج نے اپنا سر پکڑ کر کہا" اب تو تو بالکل دیوانی ہوگئی ہے یہ گُن تو زمرد اور یاقوت کے بھی نہ تھے جواب تو کرنے جا رہی ہے؟ آخر تیرا اور قمر نواب کا کیا جوڑ؟ ـــــ ذرا پھر سے تو کہہ یہ چھوٹی بڑی سوئیاں کیا کہہ رہی تھی؟"

"میں یہ کہہ رہی ہوں۔ نیلم نے پھر آنکھیں مٹکا کر ہوش و حواس میں کہنا شروع کیا۔ دو چھوٹی بڑی سوئیاں ہوتی ہیں۔ ہر گھڑی ہیں۔ اور جب وہ دونوں مل جاتی ہیں تو بارہ بجتے ہیں۔

میری اماں ...... نیلم کی آواز میں اب خوشامد آگئی۔ تم کسی سے کہنا نہیں قمر نواب یہی سمجھا رہے تھے۔ جیسے وہ بڑی سوئی ہیں۔ اور میں چھوٹی اور جس طرح گھڑی کی سوئیاں آپس میں مل جاتی ہیں ہم دونوں ملتے ہیں۔ اور تب بارہ بجتے ہیں۔ میری اماں کسی سے کہنا نہیں۔ قمر نواب کہتے تھے بڑی بری بات ہے۔"

"اور اب جو تو قمر نواب کے پاس اکیلے میں گئی تو تیرے بال مونڈ لوں گی" "دیکھوں نواب تو کیسے جاتی ہے۔ بیگم صاحبہ کو اگر وقت پوچھوانا ہے تو مجھے بھیجیں تیرے جانے کی وہاں کوئی ضرورت نہیں" اور پھر اُس نے نیلم کو

محبت سے سمجھانا شروع کردیا۔ یہ نواب زادے ہیں۔ ادھر دیکھ یہ بال میں نے انھیں کی صحبت میں سفید کیے ہیں۔ یہ جو بیگم بنی بیٹھی ہیں۔ کشور آرا۔ انھوں نے اپنی چوڑیاں میری بدولت ٹھنڈی کر ڈالی تھیں۔ کہتی تھیں میں رانڈ ہو گئی گھر کی ملکہ تو بچھراج ہے۔ نواب صاحب مجھ پر ریجھتے تھے۔ ایسی ہی چھوٹی بڑی سوئیاں چلی تھیں۔ مگر میری بڑی سوئی بارہ بجا کر آگے نکل گئی۔ میری قسمت میں یہی موا چولھا چکی تھا اور اُن کی قسمت میں راج پاٹ تو آخر سمجھی کیا ہے قمر نواب تیرے ساتھ بیاہ کریں گے؟ بس بارہ ہی بجانے بھر کے ہیں۔ خدا کے لئے ذرا ہوش میں آجا۔

نیلم بولی میں نے یہ سب کچھ تو نہیں کیا، تم نہیں جانے دو گی تو میرا کیا بگڑے گا۔ بیگم صاحب ویسے ہی جلی کٹی باتیں کیا کرتی ہیں۔ پھر گھر سے نکال باہر کریں گی جوتی کی نوک سے۔ بچھراج نے پینترا بدل کر کہا۔ "کل کی نکالتی آج ہی نکال دیں" پھر دوسرا پینترا بدل کر بولی "کیا مفت دیتی ہیں کھانے کو؟ دن بھر ہڈیاں توڑتی ہوں جب پیٹ بھرنے کو ملتا ہے۔ ایسے گھر تو بہت ہیں جہاں ہاتھ پاؤں ہلا کر روٹی مل جائے اسی گھر پر کیا ٹھکانا ہے۔ البتہ تیرے گلچھروں میں آگ لگ جائے گی تو ہی رکھی ہے اس گھر پر۔

نیلم نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے گھٹنے پر سر ڈال دیا اور ماں کی باتیں خاموشی سے سنتی رہی موٹے موٹے آنسو اُس کی آنکھوں سے گرنے لگے جیسے اُسے اپنی ماں کی بربادی کا صحیح احساس ہو گیا۔ اس نے اب حقیقت کی آنکھوں سے قمر نواب کے تیسری منزل والے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا۔ جس میں وہ ذرا دیر پہلے وقت دریافت کرنے گئی تھی۔

اسنے اپنی بساط بھر کچھ اس طرح سوچا۔ اس کمرے میں رفعت آرا بیگم کا راج ہوگا۔ بیگم صاحب کی بھانجی کا جن کے ساتھ قمر نواب کی بات چیت ٹھہر چکی ہے۔ اس کمرے میں ایک طرف ان کا بڑا سا سنگار دان ہوگا۔ فرش پر جہیز کا پان دان، اگالدان، خاص دان رکھا رہے گا۔ الگنی پر زربفت اور کمخواب کے عروسی جوڑے ٹنگے ہوں گے۔ دوپٹوں کے منقش دار آنچل لچکے اور کامدانی کا گھنا جال ان الماریوں کی زینت بنے گا۔ یہ سوچتے سوچتے اُس کی نظر اپنے جارجٹ کے بوسیدہ دوپٹے پر گئی جو پارسال کشور آرا نے محرم میں اُسے اوڑھنے کے لئے دیا تھا۔ توبہ توبہ۔ اُسے خود اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی۔ اسنے اپنے پھٹے جوتے کے اندر سے اپنے میلے میلے پاؤں دیکھے تو اور شرما گئی۔ کیسی بے جوڑ سوئی ہے اماں سچ کہتی ہیں ایسی سوئیاں بارہ نہیں بجایا کرتیں۔ اور اگر بجائے گی تو غلط بجائے گی۔ پھر آخر یہ قمر نواب مجھ سے کیا کہہ رہے تھے۔ بارہ بج گئے —— بری بات —— کسی سے کہنا نہیں —— سچ مچ بری بات ہے میں یہی رہوں گی جو اب ہوں۔ خادمہ۔ پیر کی جوتی۔ راج پاٹ رفعت آرا بیگم کریں گی —— اور پھر اس تیسری منزل والے کمرے کے دروازے بند رہیں گے۔ انھیں وقت وقت سے کھلنا نصیب ہوگا۔ ناشتے کے وقت۔ کھانے کے وقت۔ میں ناشتہ لئے ان بند دروازوں کے کھلنے کا انتظار کیا کروں گی۔ بیگم صاحبہ کہیں گی ذرا قمر نواب سے جاکر وقت پوچھ آ۔ میری جوتی جائے گی وقت پوچھنے؟ کس سے پوچھوں گی وقت؟ بند دروازوں سے؟ اور اُس وقت قمر نواب وقت کیوں بتلانے لگے؟ رفعت آرا بیگم جب آجائیں گی تو بارہ کاہے کو بجیں گے؟ بارہ وقت سے

بجتے ہیں۔ ہر وقت نہیں بج سکتے۔ اس وقت بارہ بجالینا نہ میرے بس میں ہوگا نہ قمر نواب کے۔ بقول اماں کے "بارہ ہمیشہ نہیں بجا کرتے" اور نیلم نے یہیں تک سوچا تھا کہ یکایک کشور آرا بیگم کی آواز گونجی "صحنچوں میں جھاڑ دکس وقت دی جائے گی؟ شام ہوگئی"

اور جیسے نیلم کو اک دم احساس ہوا کہ دن ڈھل چکا ہے چھوٹی سوئی سے بڑی سوئی بہت دور نکل گئی ہے۔ سورج کی شعاعیں محل کے اُس پار ایک دیوار کے چھوٹے سے ٹکڑے پر پڑ رہی تھیں ——— مگر یہ سب تخئیل کی دنیا میں ہو رہا تھا عمل کی دنیا میں نہیں۔

دن گزرتے گئے اور یہ سوئیاں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتی رہیں کھیراج کے جب یہ سارے حربے بے کار گئے تو اُس نے نیلم کو بدنام کرنا شروع کر دیا۔ وہ جب دوسروں سے اپنا دکھڑا روتی تو سب کچھ کہہ ڈالتی۔

"بڑی ڈھیٹ ہے۔ خاصی لبلا ہو رہی ہے نہ کسی کا سمجھانا کارگر ہوتا ہے نہ بجھانا۔ اور میں تو سب کچھ کر ہاری۔ اب تو بات میرے قابو سے بھی باہر ہو گئی ہے۔" پھر ماتھے پر ہاتھ دے مار کر کہتی "کچھ ہی دنوں میں سُن لینا جو کچھ ہونے والا ہے" فیروزہ نے دھتڑ مار کر کہا "ہائے غضب۔ اس کے آگے کچھ اور بھی ہونے والا تو پھر جلدی سے کہیں مانگ بیاہ دو۔ جھگڑا ختم ہو"

کھیراج بولی "کون کرے گا شادی مال زادی کے ساتھ؟" بی بی کے گنوں کی کسے خبر نہیں؟ اب تو بستی میں کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی ——— اور یہ خبر اڑتی پڑتی رفعت آرا بیگم کے یہاں پہنچی۔ وہاں بھی بڑے بوڑھوں نے دانتوں کے

نیچے انگلیاں دبائیں ۔

"دلہن کی نانی اماں بولیں" نوج قربان گیا۔ جب دل کی چین نہ ہوئی تو روپیہ پیسہ بے کار ۔

دوسری بولیں "اور کیا۔ بھاڑ میں گیا وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان"

تیسری بولیں۔ "اب بھی سویرا ہے۔ کشور آرا سے کہو اُس مردود کو گھر سے نکال دیں۔ اور پھر جب قمر اور نیلم ایک دن تنہائی میں ملے تو نیلم کہنے لگی۔

اماں کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ اور اب وہ بستی بھر میں مجھے بدنام کرتی پھرتی ہیں۔"

قمر ہنسنے لگا۔ وہ نیلم کی اس قسم کی شکایتیں سُن کر ٹال دیا کرتا تھا۔

"اور آپ بھی بدنام ہو گئے ہیں۔ دولہن والے شاید کہتے ہیں کہ شادی نہیں ہو سکتی۔"

"تو پھر" قمر نواب نے دوسرا قہقہہ بند کیا۔ پھر پوچھا کیوں ؟

"اُن کے نزدیک نواب صاحب کی بہو میں ہوں" نیلم اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے قمر نواب کو گھورنے لگی۔

"بکنے دو" اور اس تھوڑے سے تخیل کے بعد عمل کی دنیا میں پھر ہلچل پیدا ہوئی۔ تیسری منزل کا خاموش کمرہ اپنے اندر دو ہستیوں کو جذب کرنے لگا۔ ساکت اور خاموش فضا میں اُبھری اُبھری سانسوں کی آواز سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر چرچراہٹ کے بعد کمرہ کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہو گئے۔ بالکل اسی طرح جیسے تخیل کی دنیا میں وہ رفعت آرا بیگم کو لے کر بند ہوں گے۔ کتنا فرق تھا اس عمل

اور تخئیل میں —— دیوار پر لگی ہوئی گھڑی کی بڑی سوئی چھوٹی سوئی کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ چھوٹی سوئی اپنی جگہ پر بے حس و حرکت بڑی سوئی کا انتظار کر رہی تھی دنیا میں یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ یہی ہوتا رہے گا۔

زندگی ایک گھڑی ہے اور واقعات اُس کی سوئیاں۔ بڑے واقعات تیزی سے بھاگتے ہیں۔ بدنامی بڑی سوئی ہے اور شادی چھوٹی سوئی۔ چھوٹی سوئی بڑی سوئی کا انتظار کر رہی تھی۔ اس بات کا انتظار کہ بدنامی اپنے سارے مدارج طے کر چکے تو شادی سے آکر مل جائے۔

اور وہ آخر مل گئی۔ واقعات جس مرکز سے چلے تھے پھر وہیں پر آکر مل گئے روشن چوکی کی شہنائیاں ہر طرف بجنے لگیں۔ رفعت آرا بیگم کے گھر پر دھوم دھام سے بارات گئی۔ نیلم نے ایک اچھا سا جوڑا زیب تن کیا اور دولہا کی خادمہ بن کر گئی۔

پھر جب دولہا رونمائی کے لئے گھر کے اندر بلوایا گیا تو نیلم اپنا مقیش کا آنچل سر پر ڈال کر دولہا کو لیکر آگے بڑھی۔ ہر طرف سے اشارے ہونے لگے کہ لیلا دم کے ساتھ ہے۔

اور پھر اُس تیسری منزل والے کمرے پر عروسانہ بہار آگئی۔

رفعت آرا کی سہیلیاں تیسری منزل تک جاتیں اور بند دروازوں کو دیکھ کر واپس آتیں۔ پھر سب نے نیلم کی خوشامد کی کہ وہ کسی بہانے سے جا کر دروازے کھلوائے کیا ان بند دروازوں کو کھولنا اب بھی نیلم کے قبضۂ قدرت میں تھا؟ وہ سب کے کہنے سے گئی۔ بند دروازوں کے پاس اُس نے کان لگا کر سُنا۔ رفعت آرا بیگم

کہہ رہی تھیں۔

"نیلم اب اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔" اور قمر ہنس ہنس کر بتلا رہا تھا۔ دیکھو بیگم اس دیوار پر لگی ہوئی بڑی سوئی کا کام صرف بھاگنا ہے۔ وہ برابر بھاگتی رہے گی۔ اُسے کہیں قیام نہیں۔ یہ دونوں سوئیاں بہت تھوڑی دیر کے لئے ملی تھیں اور الگ الگ ہو گئیں۔

نیلم اُلٹے پیروں واپس آ گئی۔ پھر ایک عجیب یاس انگیز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"دروازے سچ مچ بند ہیں۔"

سائبان کے نیچے

شہر کا یہ پرانا سائبان - آج تک اُس کی صحیح عمر کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکا مدت سے اسی طرح کھڑا ہے - رات اور دن میں اس کے نیچے سے مختلف شکلوں کے ہزاروں انسان گزر جاتے ہیں - ہنستے ہوئے - روتے ہوئے، مسکراتے ہوئے - اور یہ سائبان ان تمام جذباتی شکلوں سے بے حس سب کو اپنے نیچے سے گزر جانے دیتا ہے -

یہ سائبان ایک عام گذرگاہ کے اوپر ہے جس کے دونوں رُخ پر اندھے مفلوج اور لنگڑے فقیر بیٹھے ہوئے ہاتھ پھیلائے ہنستے، روتے اور مسکراتے انسانوں سے بھیک مانگا کرتے ہیں - ہنستے اور مسکراتے ہوئے انسانوں کو یہ اپنے اوپر والے سائبان کی طرح بے حس سمجھتے ہیں اور اُن سے سوال کرتے ہوئے اُن کی آوازیں بھی مفلوج اور مردہ بن جاتی ہیں - یہ قہقہوں اور مسکراہٹوں کے پیچھے دوڑ کر انہیں اپنی غربت اور بھوک کا احساس دلانا چاہتے ہیں اور اکثر حالتوں میں اُن کے دراز پھیلے ہوئے ہاتھوں پر کچھ ڈال دیا جاتا ہے - ہنسی گریہ کو خیرات کرتی ہے - ہنستے اور مسکراتے ہوئے لوگ گزر جاتے ہیں - مفلوج اور

اندھے فقیر چیخا چلایا کرتے ہیں۔ اور یہ بے حس سائبان اور اس کے نیچے کی خاموش گذرگاہ یہ تماشہ دیکھا کرتی ہے۔

روتے ہوئے انسانوں کو یہ اپنے پاس سے گزرتے دیکھ کر خود بے حس بنجاتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں کہ اچھا تو یہ غربت دوسروں کو بھی بخشی گئی ہے۔ صرف سائبان ہی کے نیچے نہیں آسمان کے نیچے بھی لوگ غریب اور مفلوک الحال ہیں۔

اِس عام گزرگاہ پر اِن فقیروں کو کافی خیرات ملتی ہے جس کا آدھا حصہ ساہورام ٹھیکیدار کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ ساہورام خود بھی ایک فقیر تھا۔ اور کسی زمانہ میں اسی گذرگاہ پر بیٹھ کر بھیک مانگتا تھا اور اب اُس نے اپنی جگہ دوسرے فقیروں کو ٹھیکہ پر دے رکھی تھی۔ شالی لنگڑا موجودہ تمام فقیروں میں زیادہ توانا اور تندرست تھا اور وہ جگو سائیں کی لڑکی گجریا سے بیٹھا دن بھر پیار محبت کی باتیں کیا کرتا تھا۔ اکثر یہ دونوں پیار محبت کی باتوں میں کھو کر بھیک مانگنا ہی بھول جاتے تھے۔ اور شام کو جب ٹھیکیدار انہیں کم پیسے وصول کرنے پر مارتا پیٹتا تو انہیں غلط طریقوں کا احساس ہوتا اور وہ سوچتے کہ ہمیں خیرات جمع کرنے کے لیئے پیدا کیا گیا ہے محبت کرنے کے لیئے نہیں۔

ایک دن گجریا شالی سے کہنے لگی "ہم دونوں چل کر کہیں اور کیوں نہ رہیں؟ اس سائبان کے نیچے اب ہمارے دشمن بہت ہو گئے ہیں"

شالی بولا یہ سب سے بڑا دشمن تو یہ سائبان ہی ہے۔ اور جہاں جائینگے وہاں بھی کوئی نہ کوئی سائبان ہی ہوگا۔ پھر جس قدر آمدنی اس سائبان کے نیچے ہوتی ہے کہیں اور نہ ہوگی"

"مگر مجھ سے تو اب ساہو رام کی مار برداشت نہیں ہوتی۔" گجریا اٹھلا کر کہنے لگی۔

"پگلی کہیں کی۔ اسے وہ مار ہی کہاں پاتا ہے۔ بس یہی دو چار دس گھونسے مجھے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ دن بھر کی محنت کے بعد کوئی بدن دواب رہا ہے۔"

"مگر مجھے تو حرامی دبا دبا کر بہت دیر تک مارتا ہے اور تم بیٹھے دیکھا کرتے ہو؟"

"بات یہ ہے تم سے زیادہ مجھے اپنے خالی پیٹ سے محبت ہے اور اس سائبان سے بھی۔"

"تو پھر میں اکیلی چلی جاؤں گی تم اس سائبان کے نیچے اپنے پیٹ کے لئے بیٹھے رہنا۔"

"اور میں تو یہ کہتا ہوں کہ ساہو رام کی نظر پر چڑھ جا۔ بس پھر کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"نظر پر کس طرح چڑھوں؟"

"ٹھیکیدار سے ہنس کر بول کر۔ بس اس کی نظروں میں چڑھ جائے گی۔"

"وہ بوڑھا خرانٹ، اُس سے ہنس بول کر میں کیا کروں گی؟"

"تو پاگل ہے وہ ہم سے زیادہ جوان اور تندرست ہے، تازہ میوے دودھ دہی، ترکاریاں ہر بڑھاپے کو جوانی میں بدل دیتی ہیں اور جہاں یہ سب کچھ نہیں وہاں ہر جوانی بڑھاپے سے بدتر ہے۔"

تازہ میوے اور دودھ دہی کا نام سن کر گجریا کے منہ میں پانی بھر آیا اور وہ سائبان کی شکستہ دیوار میں آنکھیں گاڑ کر کچھ سوچنے لگی۔ شالی اپنی جگہ سے اُٹھ کر لنگڑاتا ہوا سڑک کے کنارے آ گیا اور سائبان کے نیچے سے گزرتے ہوئے ایک غول کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا "لنگڑے محتاج کو ایک پیسہ ـــــ"

غول میں سے ایک شخص بولا "اس لڑکی کو دینگے۔ تجھے نہیں"۔
شالی نے گجریا کو چپکے سے آنکھ مار دی۔
"مجبور بے بس کو ایک پیسہ بابو جی" گجریا ہاتھ پھیلا کر سامنے آ گئی۔
"ایک روپیہ لے گی؟"
"نہیں"
"میرے ساتھ چلے گی؟"
"نہیں"
"اچھا چل تجھے مٹھائی خرید دوں"
"نہیں"
"تو پھر کیا پیسہ مفت کا ہے جو دے دوں۔ چل ہٹ یہاں سے" اور وہ سارا غول قہقہے لگاتا ہوا سائبان کے نیچے سے آگے بڑھ گیا۔
"پگلی کہیں کی۔ روپیہ کیوں نہ لیا" شالی گجریا کو ڈانٹنے لگا۔
"وہ تو مجھے ساتھ لے جانے کو کہہ رہا تھا"۔
"پھر چلی کیوں نہ گئی۔ بہت سی مٹھائی خرید دیتا پھر دونوں مزے میں بیٹھ کر کھاتے"
"اور جو باپو کو پتہ چل جاتا! مجھے زندہ گاڑ دیتے زمین میں!"
"جگو باپا کو۔ آہی ہی ہی" شالی ہنسنے لگا "وہ تو اندھے ہیں دنیا کی ہر بات کی طرف سے اب انکی آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ اُن کی آنکھوں کی ساری طاقت اب تمہاری آنکھوں میں آگئی ہے۔ تم دنیا کو دیکھو اور سمجھو۔ تم اگر اس جوان کے ساتھ چلی

جائیں تو میں یہاں موجود رہتا۔ جگو بابا میری باتوں میں بہل جاتے اور تم مٹھائی کا دونہ لے کر واپس آجاتیں۔"

شالی کی باتیں گجریا کی سمجھ میں آنے لگیں اور اُس نے سوچا کہ سائبان کے نیچے اس محدود دنیا سے نکل کر ذرا باہر کی سیر کروں۔ تازے میوے، دودھ دہی اور مٹھائیوں کے مزے چکھوں۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد پھر یہ چیزیں کہاں ملیں گی۔ اس نے سائبان کے نیچے ہر چیز کا جائزہ لیا ہر چیز مردہ اور بے حس حرکت نظر آنے لگی۔ بے مصرف زندگی اندھے اور لنگڑے فقیروں کا جماؤ اور اُن سب کے درمیان اس کا خوبصورت اور تندرست جسم! اُسے تھوڑی دیر کے لیئے شالی لنگڑے سے بھی نفرت پیدا ہو گئی۔ اُس وقت اُس کے مفلوج تخئیل کو سوچنے میں بڑی مدد مل رہی تھی جیسے اس کے مردہ خیالوں میں کسی نے روح پھونک دی ہو۔

سرِ شام ساہو رام حسبِ معمول سائبان کے نیچے آیا۔ اور تحکمانہ انداز میں فقیروں کو بلانے لگا۔ آج وہ گجریا کو سکھو لنگڑے کے پاس بیٹھا نہ دیکھ کر خوش تھا۔ پھر سب فقیروں سے حساب کرنے کے بعد وہ مسکراتا ہوا گجریا کے پاس آیا۔ گجریا بھی اُسے دیکھ کر زبردستی مسکرانے لگی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے گجریا سے اپنی مسکراہٹ کا جواب پاکر اپنی آمدنی کا آدھا حصہ اس کے ہاتھ پر رکھدیا۔ گجریا نے اپنی مٹھی بھری پاکر پہلے پیسوں کی طرف پھر شالی لنگڑے کی طرف بہت غور سے دیکھا۔

شالی نے اشارہ کیا "لے لے" اور پھر منہ پھیر کر خود بھی ہنسنے لگا۔ جیسے

کہہ رہا ہو "بس چڑھ گئی نظروں پر"۔

ساہو رام تھا ادھیڑ عمر کا مگر طبیعت میں جولانی جوانوں سے زیادہ تھی۔ غیر شادی شدہ تھا۔ اور اب اپنی اس حالت میں شادی کے لئے بہت زیادہ فکرمند رہتا تھا۔ گجریا اُس کی نظروں پر چڑھ گئی تھی اور دونوں کی مسکراہٹوں نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

سائبان کے نیچے دو مسکراتے ہوئے انسانوں کو دیکھ کر شالی لنگڑے نے وقت سے فائدہ اُٹھانا چاہا۔ وہ ان دونوں کے قریب کھسک کر بولا۔

ٹھیکیدار۔ آج میں کچھ نہ لُوں گا۔ صبح سے بیٹھا گجریا کو سمجھا رہا ہوں تب کہیں جا کر تمہارے سامنے مسکرائی ہے۔"

ساہو رام ہنسنے لگا اور گجریا کے چہرے پر نظریں گاڑ کر بولا "کیا کہہ رہا ہے شالی؟" گجریا شرما کر جگو بابا کے پاس بھاگ گئی۔

شالی ساہو رام سے بولا" اور سہرے کا رہبر انعام؟"

ساہو رام آگے بڑھ گیا۔ شالی لنگڑا گھسٹتا ہوا پیچھے پیچھے چلا" آج تو انعام ضرور لینگے ٹھیکیدار۔ جریں کی خاطر"

وہ اس وقت خوشبوؤں اور مسکراہٹوں کے پیچھے دوڑ کر ساہو رام کو اپنے شوق کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ آخر کار ٹھیکیدار نے ایک چونی دے ہی ڈالی —— خوشی نے گریہ کو خیرات کر دی۔ ہنستا اور مسکراتا ہوا ٹھیکیدار گزر گیا۔ منظرج اور انہتے فقیر بیٹھے رہے اور یہ بے حس سائبان اور اسکے نیچے کی خاموش گزرگاہ یہ تماشہ دیکھا کی۔

گجریا اپنے باپ کے تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں میں پیسے دیکر بولی "آج سے تم بھیک مت مانگا کرو۔ ٹھیکیدار سے ہمارا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اور اب وہ ہماری آمدنی سے حصہ نہیں بٹائے گا۔"

جگو بابا نے گجریا کو بہت سی دعائیں دی۔ آج اُس نے پہلی دفعہ گجریا کو اپنی اولاد سمجھ کر گود میں بٹھایا۔ پھر کہنے لگا۔ "خدا تیری کمائی میں اور برکت دے۔"

شالی لنگڑے نے پاس کھسک کر کہا "سا جھا کرتے ہو جگو بابا۔"

"کاہے میں؟"

"چرس میں؟ آج یہ خوشی اسی چیز سے منائی جائے گی۔"

"کیسی خوشی؟" جگو بابا اپنے منہ میں چرس کا مزا محسوس کرتے ہوئے بولے۔

"تمہاری لڑکی بالغ ہو گئی ہے۔ اور اب اس کی شادی ٹھیکیدار کے ساتھ ہو جائے گی۔" اور پھر وہ جھوم جھوم کر گانے لگا۔ "سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔"

شالی لنگڑے کی باتوں نے جگو بابا کو چونکا سا دیا۔ اس نے گجریا کو اپنی گود میں بھینچ لیا جیسے اسے کوئی چھیننے لئے جا رہا ہو۔ گجریا نے ایک چوتی نکال کر شالی کے حوالے کر دی۔ پھر بولی "آج باپو بھی تمہارے ساتھ چرس پئیں گے۔ آج ہم سب ہنسیں کھیلیں گے۔ زندگی میں میں نے باپو کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا شاید تمہارے ساتھ چرس پی کر ہنسیں۔"

اور پھر اُس رات چرس کے دور چلے۔ سائبان کے نیچے زندگی کے تمام آثار پیدا ہو گئے۔ ہنستے اور مسکراتے ہوئے انسانوں نے اپنے قہقہوں سے سائبان کی چھت ہلا دی۔ گجریا باری باری سے ہر فقیر کو چرس پلا رہی تھی۔ اور سب مستی

اور خوشی میں جھوم رہے تھے۔

یہ وقتی دور بہت جلد ختم ہو گیا۔ اور پھر وہی اداس اور سنسان دن سائبان کے نیچے گذرنے لگا۔ گذرگاہ کے دونوں رخوں پر بیٹھے ہوئے اندھے اور مفلوج فقیر ہنستے روتے اور مسکراتے ہوئے انسانوں سے ہاتھوں کو پھیلائے سوال کرنے لگے۔ گجریا اب بالکل آزاد رہنے لگی۔ وہ شام ہوتے ہی ٹھیکیدار کی راہ تکنے لگی اور اس کے آنے پر اس کی آمدنی کی آدھی رقم اپنے ہاتھ میں لیتی۔ البتہ شالی کے پیسے وہ ٹھیکیدار کے چلے جانے کے بعد واپس کر دیا کرتی تھی۔ اب اس کے یہاں دونوں وقت چولھے پر ہانڈی بھی چڑھتی تھی۔ اور اس کی خوشبو سے دوسرے فقیروں کا دل للچایا کرتا تھا۔

پھر ایک دن شالی لنگڑا ملا گجریا سے کہنے لگا "اب بتا میری محبت میں مزا ہے یا ٹھیکیدار کی محبت میں؟ ہم دونوں بھوکے تھے اور بھوک میں محبت زندہ نہیں رہ سکتی۔ اب میری ایک بات اور اپنی گرہ میں باندھ لے"۔

گجریا دھیان دے کر سننے لگی۔

شالی بولا "سائبان کے نیچے سے ہر جانے والی کی نظر تیرے اوپر پڑتی ہے تیرے پاس حسن ہے۔ تجھے کیا پڑی ہے کہ تو ایک فقیر کے گھر بیٹھے۔ تیرا حسن تیری طرح ذات برادری کا محتاج نہیں ہے تو ایک محتاج گھر میں پیدا ہوئی اور بھکارن ہے مگر تیرا حسن بڑا مالدار ہے۔ اور کسی مالدار گھر میں جانے کے قابل"۔

"تو پھر کیا مطلب ہے۔ ٹھیکیدار کے گھر جانے سے انکار کر دوں؟"

"فائدہ تو اسی میں ہے۔ ویسے تیری مرضی۔ مگر یاد رکھ دنیا میں حسن کی بڑی قیمت ہے۔ پہلے اس کی قیمت وصول کر لے ٹھیکیدار کے گھر چلی جانا"۔

"شالی تم نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے" گجریا کہنے لگی "میں تو یہ چاہتی تھی کہ تم میرے ساتھ رہتے اس ٹھیکیدار اور دنیا والوں کے چکر میں مجھے کیوں ڈالتے ہو"

"تیرے بھلے کے لئے" شالی کہنے لگا "میں تو موجود ہی ہوں۔ ٹھیکیدار بھی کہیں نہ جائیگا۔ مگر اس سائبان کے نیچے سے بھاگتے ہوتے لوگ پھر نہ ملیں گے"

"ہاں۔ مگر یہ سب کچھ مجھ سے نہ ہوگا"

"یہ سب کچھ تو میں کردوں گا تیرے لئے۔ ایک تیرا ہی جیسا خوبصورت جوان ڈھونڈھ دوں گا"

اور دوسرے دن وہ شالی لنگڑا اُسی سائبان کے نیچے کسی منچلے جوان سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔

"کس بھاؤ پر مل جائے گی؟"

"کسی سرائے میں لے جایئے۔ بھاؤ بتاؤ کی ضرورت نہیں۔ البتہ میری مزدوری مجھے دے دیجئے"

"ہاں ہاں ضرور" اور نوجوان نے جلدی سے پانچ کا ایک نوٹ نکال کر لنگڑے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

سائبان کے نیچے سے ایک سایہ حرکت کرتا ہوا دیوار سے ملا ملا نکل گیا اور رات کی بے پناہ تاریکیوں میں گم ہو گیا۔

نہا دھو کر اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر جس وقت گجریا نے بڑے سے آئینہ میں اپنی شکل دیکھی تو دنگ رہ گئی اور دل ہی دل میں کہنے لگی "میرا حسن بڑا قیمتی ہے جی چاہتا ہے خود اپنے حسن کے دام لگا کر اُسے خرید لوں۔ یہ کیوں کسی دوسرے

کے ہاتھوں بکے؟"

اور پھر گجریا نوجوان کے ساتھ موٹر پر بیٹھ کر گھومنے لگی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ آج اُسے موٹر ایسی سواری پر چڑھنا نصیب ہوا تھا۔ گجریا کا ایک ہاتھ نوجوان نے اسٹرینگ پر رکھ کر اپنے ہاتھ سے دبالیا اور وہ بے اختیاری طور پر چونک پڑی

"کیوں ڈر کیوں گئیں؟ کیا اور کسی نے موٹر پر تمہیں نہیں گھمایا؟"

"نہیں"

"آج پہلی دفعہ میرے ساتھ گھوم رہی ہو؟"

"ہاں"

"یہ لنگڑا تمہارا کون ہے؟"

"کوئی نہیں۔"

گجریا کی نگاہوں سے اب تک معصومیت نہیں گئی تھی۔ نوجوان نے مزید معلومات کرنے کے لئے پھر پوچھا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

"گجریا"

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

"باپو ہیں، ماں مر گئی"

"اُس لنگڑے نے تمہیں اور کہاں کہاں بھیجا؟"

"کہیں نہیں۔ پہلے ٹھیکیدار کے گھر بھیج رہا تھا۔ پھر آپ کے ساتھ کر دیا۔"

"تم کہاں جانا چاہتی تھیں؟"

"کہیں نہیں۔ آپ مجھے سائبان کے نیچے میرے باپو کے پاس پہنچا دیجئے۔"

اتنے میں موٹر ایک عالیشان پھاٹک کے سامنے جا کر رک گئی۔ دونوں اُتر کر اندر گئے اتنی بڑی عمارت، ساز و سامان، سفید پوش بیروں کو دیکھ کر گجریا دنگ رہ گئی۔

دونوں ایک سائیڈ روم میں بیٹھ گئے۔ ایک نوجوان بیرے نے آکر سلام کیا۔

"جان ہیگ اور میم صاحب کے لئے مٹن چاپ، پٹیٹو چاپ۔ انڈا چکن وغیرہ وغیرہ" بیرا میم صاحب کی گھبرائی ہوئی نظروں کو تاڑ گیا اور ہنستا ہوا کمرہ سے باہر نکل گیا

تھوڑی دیر میں یہ تمام چیزیں میز پر چن دی گئی۔

جان ہیگ کا ایک پیگ ختم ہوا۔ دوسرے پیگ کے لئے نوجوان نے پھر بیرے کو آواز دی۔ باقی تمام چیزیں میز پر بدستور رکھی تھیں۔

"تم نے کچھ کھایا نہیں؟"

گجریا نے گردن ہلا دی۔

"کانٹے، چھری اور چمچے اُٹھا لے جاؤ۔ میم صاحب ہاتھ سے کھائے گی۔

کانٹے۔ چھری اور چمچے اٹھا لئے گئے۔

"اب کھاؤ نا"

گجریا نے پہلا نوالہ ڈرتے ڈرتے اُٹھایا۔ پھر مزہ پا کر ہر چیز پر ٹوٹ پڑی۔

جان ہیگ کا دوسرا پیگ بھی ختم ہوا اور اس کی جگہ تیسرا پیگ آگیا۔ گجریا بری طرح کھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔

"آہستہ آہستہ کھاؤ" نوجوان نے آخر کار گجریا کے بے صبر ہاتھوں کو ٹوکا۔

"یہ سب تمہارا ہی کھانا ہے ابھی ہم تمہارے لئے اور کھانا منگائیں گے؟"

بے صبر ہاتھوں میں صبر آگیا۔

"اِس ہوٹل میں کبھی پہلے بھی آئی ہو؟"

"نہیں۔"

"تمہیں یہ جگہ پسند ہے؟"

"ہاں"

"میرے ساتھ یہاں رات رہو گی؟"

"نہیں"

"تم میرے ساتھ یہاں کیوں آئی ہو؟"

"شالی نے کہا تھا۔"

"اس نے تمہیں کیوں بھیجا ہے جانتی ہو؟ تمہیں اچھے کپڑے پہنانے کے لئے تمہیں عمدہ اور لذیذ کھانا کھلانے کے لئے۔ اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔ اچھا کچھ نہیں تمہارے کھانے کے لئے کچھ اور منگایا جائے؟"

"نہیں۔ یہ بچی ہوئی چیزیں میں اپنے باپو کے لئے لے جاؤں گی۔"

"یہ اس ہوٹل کا دستور نہیں۔ یہاں سے کوئی چیز باہر نہیں جانے پاتی۔ اور آج کی رات تم بھی باہر نہ جانے پاؤ گی۔"

صبح ہوتے ہی جگو بابا نے گجریا کو پکارنا شروع کیا۔ وہ بڑی دیر تک پکارتا رہا۔ اور ایک ایک سے گجریا کو پوچھتا رہا۔ سائبان کے نیچے آج تشویشناک جستجو کے ساتھ سب گجریا کو پکار رہے تھے۔ مگر گجریا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ آخرکار شالی لنگڑا کھسکتا ہوا اندھے کے قریب بیٹھ کر بولا۔" اب وہ اس سائبان کے نیچے نہیں ہے۔ یہ سائبان اُسے اپنے

اندر نہ رکھ سکا۔ یہ صرف اندھے، لنگڑے، اور لولوں کی جگہ ہے۔ کسی خوبصورت حسین اور تندرست لڑکی کی نہیں"

بڈھا اک دم چلا چلا کر کہنے لگا "تم ہی نے اُسے کہیں بھیجدیا۔ تم دلال ہو اس سائبان کے نیچے سے تمہیں نے اُسے نکال کر باہر پھینک دیا"

"اور اب وہ کسی عمدہ سائبان کے نیچے پڑی سو رہی ہوگی۔ رات بھر کی جاگی ہوئی صبح ہوتے ہوتے سوئی ہوگی۔ گھبراتے کیوں ہو وہ اب بھی کسی سائبان کے اندر ہوگی اس دنیا میں ہرجائی کے لئے سینکڑوں سائبان ہیں۔ اس سائبان میں اُسکے لئے کوئی جگہ نہ تھی"

"اچھا تو میری گجریا کو مجھے واپس لادو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔ سر شام ٹھیکیدار آکر مجھے زندہ مار ڈالے گا۔ تم نے میرے ساتھ بڑی دغا کی"

اور شام کو ٹھیکیدار اپنے جاہ و جلال کے ساتھ آگیا۔ آتے ہی اس کی نظریں گجریا کو ڈھونڈنے لگیں۔ اس نے ہر طرف گجریا کو پکارنا شروع کیا۔ فقیروں کی زبانیں سائبان کی دیواروں کی طرح بے حس وحرکت اور خاموش تھیں۔

پھر ایک موٹر تیزی کے ساتھ آکر سائبان کے نیچے رُک گیا۔ سب فقیر صدائیں لگاتے ہوئے دوڑے۔ نوجوان نے گجریا کو موٹر پر سے اُتارتے ہوئے کہا۔ لو یہ تمہاری بھیک تمہیں واپس کرتا ہوں"

موٹر پھر سائبان کے نیچے سے باہر نکل گیا۔ گجریا نے ٹھیکیدار کے ہاتھوں پر دس روپے کا ایک نوٹ رکھ کر کہا۔

"ہماری کل رات کی آمدنی کا آدھا حصہ۔

"مگر اتنی لمبی بھیک تجھے کہاں ملی؟" ٹھیکیدار بجلی کی طرح کڑک کر بولا۔

"یہ میرے حسن کی خیرات ہے۔ اسے ایک ہنستے ہوئے انسان نے دیا ہے۔ دنیا کا ہر ہنستا ہوا انسان حسن کو خیرات کر سکتا ہے۔ تمہاری روتی صورتیں مفلوج اور بیکار ہاتھ اس سائبان کے نیچے دو چار پیسوں اور روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کے علاوہ اور کچھ وصول نہیں کر سکتے۔"

وہ حقارت بھری نظروں سے اب ستالی لنگڑے کی طرف دیکھ رہی تھی جو کچھ دور بیٹھا ہوا اُس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ وہیں اپنے مقام پر بیٹھا بیٹھا ہنسا پھر کہنے لگا۔ پاگل لڑکی۔ یہ اتنی بڑی دنیا دراصل ایک سائبان کے نیچے ہے اور زندگی ایک ایسی گزرگاہ جس کے دونوں رُخ پر ہنستے روتے اور مسکراتے ہوئے لوگ بیٹھے بھیک مانگا کرتے ہیں۔

نیچے نگر کا چاند

سڑک پر ایکدم لوگوں نے چلانا شروع کر دیا۔ بہت سی بے ہنگم قسم کی آوازیں آنے لگیں "عید کا چاند ہو گیا" سب یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے۔ "ہو گیا ہو گیا"

سڑک سے ملی ہوئی ایک عمارت کے درمیانی حصہ میں درزی کی مشین بڑے زور سے چل رہی تھی۔ وہ زیر لب اپنی مشین کے تال کے ساتھ گا بھی رہا تھا۔ "ہماری گلی سونی، سونا دیس" وہ اس تمام شور و غل سے بے نیاز اپنی مشین چلانے اور گانے میں مست تھا۔ گھر میں ایک بیوہ بہن تھی۔ اس کے دو بچے دیوار سے لگے سڑک کا یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ چاند شاید انکے یہاں نہیں نکلا تھا۔

نیچے کے حصہ میں ایک بوسیدہ سی چھت کے نیچے لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے، یہ ایک اندھے فقیر کی جائے پناہ تھی۔ اس کی ایک جوان لڑکی صبح سے دردِ زہ میں مبتلا ہو کر رو پیٹ رہی تھی۔ سب سے اوپر کے حصہ میں ایک بابو صاحب مع اپنی بیوی اور ایک عدد بچی کے بسلسلہ ملازمت مقیم تھے۔ اُن کے یہاں چاند

نکلا تھا بابو اپنی بیوی کو مبارکباد کہہ کر یقین دلا رہا تھا۔ کہ ہو گیا، بچی سارے گھر میں گھوم پھر کر تالیاں بجا بجا کر کہہ رہی تھی "ہو دیا پاپا ہو دیا۔"

بابو صاحب، درزی اور اندھا فقیر، یہ تینوں ایک ہی منزل کے الگ الگ قطعوں میں رہتے تھے، سماجی زندگی اس طرح تین حصوں میں بٹی تھی، کہ انسان انسانوں کے سروں پر کھڑا ہو کر چاند کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ کوئی ہنس کھیل کر کوئی مشین چلا کر، کوئی رو پیٹ کر۔

سب سے نیچے کے قطعے سے کسی نے آواز لگائی "کیا ہو گیا کریم ماسٹر؟"

اس سوال کو کریم ماسٹر نے اوپر اچھال دیا۔ "کیا ہو گیا بابو صاحب؟" اور بابو صاحب نے سوال کو نیچے کی طرف پھینک دیا "ہاں ہو گیا۔ ہو گیا۔"

حصے اگر اور ہوتے، تو سوال اور اوپر تک چلا جاتا۔

"ہاں واقعی ہو تو گیا" بابو صاحب کی بیگم مسکرانے لگیں۔ بادل کی آڑ میں باریک سا ہلال ساری دنیا کو دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

بیگم تنک کر بولیں "تو پھر کریم ماسٹر سے کہئے۔ آپ کی شیروانی اور لنسری کا سوٹ کب دے گا؟"

بابو صاحب نے کریم ماسٹر کو پکارا۔ مگر اس وقت وہاں گانا بڑے زور شور سے ہو رہا تھا۔ اس کے دونوں بھانجے بیٹھے ہوئے کپڑوں میں بٹن ٹانک رہے تھے مشین دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ چل رہی تھی۔ اور سب مل کر گا رہے تھے۔

ہماری گلی سوتی سونا دیں۔

چاند کے گرد آکاش پہ تارے

دھرتی پر جیسے بے چارے
اندھے۔ لولے دُکھ کے مارے

دلویں ایک سندیس   ہماری گنگی سونی، سونا دیس!

اور ساتھ ہی مشین کی گھڑ گھڑاہٹ، فضا میں کچھ ایسا سوز و گداز تھا جیسے جانباز سپاہی مار دھاڑ کرتے ہوئے کسی خوش آئند نغمہ کے سہارے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

بابو صاحب کچھ دیر کھڑے سنتے رہے، پھر آکر بولے "وہ سب گانے میں مشغول ہیں۔ میری آواز کام نہیں کرتی"۔

بیگم نے جا کر کریم کی بیوہ بہن کو آوازیں دینا شروع کیں "ارے بغاتن ارے بغاتن!"

بغاتن کچھ دور بیٹھی اندھے فقیر کے کمرہ کی طرف جھکی ہوئی کچھ دیکھ رہی تھی۔ یہ جھکاؤ قابلِ غور تھا۔ عید کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ بیگم صاحبہ، کریم ماسٹر کے یہاں اور کریم ماسٹر کی بیوہ بہن اندھے فقیر کے یہاں جھکی ہوئی تھی۔ گویا دنیا اوپر سے نیچے کی طرف جھک گئی ہے۔

"کیا ہے بیگم صاحبہ"؟ بغاتن نے پکار کر پوچھا۔

"وہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ یہاں آؤ"۔

بغاتن نے بتلایا "گجریا کی مشکل کسی طرح آسان نہیں ہوتی۔ صبح سے یہ وقت آیا چیختے چلاتے ہوئے۔ بڑی مصیبت ہے بیچاری پر"

"کون گجریا، وہ اندھے فقیر کی بیٹی؟" بابو کی بیگم نے یوں ہی ازراہِ ہمدردی پوچھ لیا

"جی ہاں، جی ہاں بڑی مصیبت ہے اس پر بیگم صاحبہ" لجانن نے کچھ عجیب سا منھ بنا کر کہا۔ مسکین اور غمزدہ لوگ شاید اپنی غربت کی صحیح ترجمانی نہیں کر پاتے لجانن بابو کی بیگم سے گجریا کی مصیبت کا حال بیان کر کے ہنسنے لگی۔ پھر اس نے کہا۔" اس وقت بڈھے کے یہاں اور بہت سے لوگ جمع ہیں۔ بڑی بڑی بڑی باتیں کر رہے ہیں۔ آپ بھی سنیئے چل کر۔"

بری باتیں سننے کو ویسے بھی دل چاہتا ہے۔ بابو کی بیگم تیار ہو گئیں۔

بڈھے فقیر کے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا۔" ابے حرامی کیا اس دن کی خبر نہ تھی بھوویلی روپیہ گانٹھ میں بچا کر رکھتا۔"

دوسرا بولا۔" بے شرم ہے بے شرم بڈھے کی آبرو کہاں کی میں ملائی۔ اب رو رہا ہے عورتوں کی طرح۔"

تیسرا بولا۔" حیادار ہے تو ڈوب مرے چلو بھر پانی میں۔"

پھر ایک شخص گڑگڑا کر بولا۔" ارے یارو یہ نصیحت کا وقت نہیں ہے۔ ایک روپیہ مجھے قرض دو۔ تو میں حلیمن دائی کو لے آؤں۔ بس سب کام بن جائے گا۔"

مجمع میں سے کسی کی آواز آئی" بے مجے تم نے اڑائے اور روپیہ دیں ہم۔ آہی ہی ہی ہی۔" وہ بے اختیار ہو کر ہنسنے لگا۔ چھت پر آ کر دو بلیاں پہلے لڑیں۔ پھر مل کر رونے لگیں، ان کے رونے اور اس کے ہنسنے کی حدیں بہت قریب تھیں،

لجانن نے بتلایا۔" وہ دیکھئے بیگم صاحبہ، وہ جو گورا گورا سا جوان بیٹھا ہے۔ سب اسی کمبخت کا کیا دھرا ہے۔"

بابو کی بیگم بولیں۔" کمبخت۔ موا سانڈ، گورا چٹا۔ ہاتھ پاؤں کا کتنا اچھا ہے۔"

"جی ہاں تبھی تو گجریا رہ گئی۔"

"اور وہ کہاں ہے؟" بابو کی بیگم نے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"وہ بیچارہ بڈھا فقیر؟ گجریا کا باپ؟"

"اُس کا تو صبح سے پتہ نہیں" بھانتن بولی: "کہیں منہ چھپائے پڑا ہوگا۔ اس حرامزادی نے تو باپ کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا۔"

گجریا کی دردناک چیخیں اس منزل کے تینوں قطعوں میں گونج رہی تھیں اور وہاں کی پتھریلی دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔ مگر منزل خاموش تھی۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا منہ بھی پتھر کا ہے۔ اس کا ہر سانس جامد ہے۔ جس میں دھڑکن نہیں۔ پیدا ہو سکتی اور جہاں دھڑکن نہ پیدا ہو۔ وہاں آواز پیدا ہونے کا کیا ذکر؟

بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے پھر کسی نے کہا: "اچھا سُن گبرو۔ (یہ اُس گورے چٹے آدمی کا نام تھا) میں ایک روپیہ اس شرط پر دیتا ہوں۔ کہ اگر گجریا بچ گئی، تو آج سے میری۔"

گبرو نے اقرار کرتے ہوئے ہاتھ پھیلا دیا۔ جیسے اس کی مٹھی میں جنت سمیٹ کر رکھ دی جائے گی۔

"اچھا کہا اللہ میاں کی کسم" اس نے جیب سے روپیہ نکال کر گبرو کو دکھایا۔

"کسم پروردگار کی۔ گجریا آج سے تیری۔ لا دھر روپیہ میرے ہاتھ پر"

سودا کر لیا گیا۔ زندگی کا سودا آپس کی دو قسموں میں طے ہو گیا۔ زندگی، سودا، قسمیں۔ غریبوں کے بازار میں یہی سکے رائج ہیں۔

گجریا نے زمین پر لیٹے لیٹے ایک بڑے زور کی چیخ ماری۔ اس نے اپنی

دونوں ایڑیوں کو زمین میں گاڑ دیا۔ جیسے وہ زمین کے اندر دھنس جانا چاہتی ہو۔
"بڑی تکلیف ہے اب گجریا پر، یہ آخری وقت ہے، اب نہیں بچے گی۔"
بیگم کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

"معلوم تو مجھے بھی ایسا ہوتا ہے بیگم صاحبہ! پھر اب کیا کیا جائے"

"میں بابوجی سے جاکر روپے مانگتی ہوں۔ اگر انھوں نے دے دیئے تو تمہیں آکر دے جاؤں گی۔ تم گبرو کو دے دینا۔"

"بڑا ثواب کا کام ہے بیگم صاحبہ۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔"

"مجھے ایک نوکر کی بھی ضرورت ہے، گبرو سے پوچھنا۔ میرے یہاں نوکری کرے گا؟"

"کرے گا کیوں نہیں، بڑی خوشی سے کریگا۔ گجریا اپنی بھیک سے سوکھے ٹکڑے دے دیا کرتی تھی۔ اور آج وہ سہارا بھی ٹوٹ رہا ہے۔"

"تو پھر تم اس سے نوکری کے لئے ضرور پوچھ لینا۔ تمہیں بھی بابوجی سے انعام دلواؤں گی۔"

"اللہ میاں جوڑی بنائے رکھیں۔ ایسے وقت میں آپ مدد کریں گی، تو گبرو عمر بھر کا غلام ہوجائیگا۔"

غلامی ہیں خواہ وہ کسی کی ہو۔ اچھے تگڑے ہاتھ پاؤں، گورے چٹے رنگ، اور چوڑے چکلے سینے کی اشد ضرورت ہے۔

بابو کی بیگم کمرہ بھر میں اِدھر اُدھر اپنا پرس تلاش کرنے لگیں۔ "میرا پرس کہاں ہے، میرا پرس؟"

بابو نے پوچھا "تم میری شیروانی اور نسریپ کے سوٹ کا تقاضہ کرنے گئی تھیں"۔

"مگر میرا پرس کہاں ہے، جلدی بتائیے"

"کیوں۔ آخر اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو"

"پرس بتا دیجئے۔ جلدی سے، بہت جلدی، میرا پرس کہاں ہے"

"جب تک تم بات نہ بتلاؤ گی۔ میں پرس نہ بتلاؤں گا"

"وہ جو گجریا رہتی ہے نا نیچے کے حصہ میں" بیگم نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "وہ اندھے فقیر کی بیٹی"

"ہاں ہاں! مر گئی کیا؟"

"مر رہی ہے۔ پرس بتائیے میرا پرس، صبح سے یہ وقت آیا اُسے اس طرح چیختے چلاتے ہوئے۔ کسی طرح مشکل آسان نہیں ہوتی"۔

"تو پھر۔ ایسے میں پرس کیا کام کرے گا؟"

"میں کچھ تھوڑے سے روپے دوں گی۔ بڑا ثواب کا کام ہے"

"ایسے عذاب ثواب کے کام تو دنیا میں بہت ہیں، روپوں سے بھی زیادہ دنیا میں اتنا روپیہ نہیں۔ کہ عذاب و ثواب مول لیا جا سکے" بابو نے کاروباری حیثیت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی۔

"مگر میں روپے ضرور دوں گی۔ میں نے وعدہ کیا ہے۔ میرا پرس دے دیجئے خدا کے لئے میرا پرس دے دیجئے"۔

گجریا نے نیچے کے حصے سے دو چار ہیبت ناک چیخیں ماریں۔ اس نے منزل کی پتھریلی دیواروں کو جھنجھوڑ ڈالا۔ عمارت کے تینوں قطعے ہل سے گئے۔

پھر جیسے وہ تمام لوگ جو اندھے نفیر کی بوسیدہ چھت کے نیچے جمع تھے، ایک دم سے چلا اُٹھے "ہو گیا! ہو گیا!"

بچہ پیدا ہو گیا تھا۔ سب یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے "ہو گیا! ہو گیا!"

سب سے اوپر کے طبقہ سے بابو کی بیگم نے آواز لگائی "کیا ہو گیا بغاتن ؟"

اس سوال کو بغاتن نے اور نیچے پھینک دیا "کیا ہو گیا گبرو؟"

اور گبرو نے سوال کو اوپر کی طرف اچھال دیا "ہاں ہو گیا۔ ہو گیا!"

زمین میں اگر گہرائی ہوتی، تو سوال اور نیچے تک چلا جاتا۔

"ہاں، سچ سچ ہو گیا بیگم صاحبہ!" بغاتن بولی "وہ کیا دکھائی دے رہا ہے؟"

زمین کے ایک میلے ٹکڑے پر ایک باریک سا ہلال بڑا چمک رہا تھا۔

یہ تیسری منزل، اس کے پتھریلے طبقے، انسانوں کے سروں پر انسان سب یک زبان ہو کر کہہ رہے تھے۔

"ہو گیا! ہو گیا ــــــــ!"

مشہور افسانہ نگار
علی عباس حسینی کا نیا شاہکار ناول
شاید کہ بہار آئی
ہم سے طلب فرمائیے

اڈے

سڑک کے کنارے اگر کوئی پریشان حال پائجامہ اور شیروانی پہنے، گوٹ دار رضائی میں لپٹا دکھائی دے تو اس سے آپ اپنی حاجت بیان کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ بڑی بڑی مشکلیں حل کر دیتے ہیں جہاں یہ جائیں ان کے پیچھے پیچھے چلے جائیے، دائیں بائیں روشنی سے دُور۔

مخصوص اڈوں پر یہ آپ کو ملیں گے۔ ان کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ آپ انہیں نہ پہچان سکیں اور یہ آپ کو پہچان لیں۔ اگر آپ ضرورت مند ہیں تو یہ فوراً آپ کے ساتھ رینگنا شروع کر دیں گے۔ زبانِ حال سے کچھ کہتے ہی جائیں گے۔ مگر مخاطب کر کے نہیں۔ اگر آپ بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے رہے تو کچھ دور پہنچ کر عام نظروں سے الگ گوٹ دار رضائی سے منہ نکال کر کہیں گے "سیر کیجئے" گا نواب صاحب بے شمار پٹاخے ہیں۔ پہلے دیکھ لیجئے اگر پسند ہو تو رہ جائیے گا۔ آپ کو شاید حیرت ہو۔ مگر عام طور پر جن لوگوں کا بیوپار ان سے رہنا ہے وہ ایک تقاضہ بہت ہی شدومد کے ساتھ کرتے ہیں۔ کسی گھر بارو کے گھر لے چلو۔ ان کا مطلب شریف بہو بیٹوں سے ہوتا ہے۔ یوں تو ہر بہو بیٹی شریف ہے طوائف نہیں۔ اس لئے کہ طوائف وہی ہے جو کسی کی بہو بیٹی یا بہن نہ ہو۔ اور یہ انہیں

مہیا کرتے ہیں۔ اُن کی زبوں حالی اور پردہ پوشی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ بہو بیٹیوں کی تجارت کرتے ہیں۔ کچھ افسردہ سے ۔ ندامت میں ڈوبے ہوئے۔ اپنی غربت کو اُن بہو بیٹیوں کے سپرد کر کے یہ لوگ ان اڈوں پر کھڑے ملتے ہیں ـــــ اور یہ باتیں ایک مہذب اڈے پر ہو رہی تھیں۔ کافی ہاؤس میں شاعر، افسانہ نگار، آرٹسٹ اور بہت سے ٹیپ ٹاپ قسم کے لوگ جمع تھے۔ بات چیت اڈوں سے متعلق تھی۔ یوں ہی بلا کسی سبب کے مختلف اڈوں کو ذہنی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ پاکستان جناح کا اڈا۔ آزاد ہند فوج یا دہلی کا لال قلعہ جواہر لال کا اڈا۔ ریڈیو اسٹیشن آرٹسٹوں کا اڈا۔ کافی ہاؤس ہمارا پیارا اڈا ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا۔

مگر صاحب، وہ پہلا اڈا جہاں سے آواز آتی ہے "نواب صاحب رہیں گے؟ اپنی نوعیت کا انوکھا اڈا ہے" ایک صاحب نے پر زور تائید کرتے ہوئے کہا۔ اور آپ اُس اڈے کو نظر انداز کرتے ہیں؟ جو پکار پکار کر برٹش سامراجیوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ کانگریس نے جو افسانہ ۱۸۸۵ء میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اس کے ختم ہونے کا وقت آگیا۔ وہ افسانہ اس ۱۹۴۶ء میں عروج پر پہنچے گا اور انتہائی کامیاب طریقہ پر ختم ہوگا۔

جی ہاں میں اس اڈے کو نظر انداز کرتا ہوں۔ وہی پہلے صاحب پھر بولے۔ بات یہ ہے اُس اڈے سے تو بے شمار داستانیں سنائی پڑتی ہیں۔ وہیں سے مسلم لیگ کا وہ مکمل ہو کر منظر عام پر آگیا ہے۔ کیا بھلا سا نام ہے "پاکستان" ابھی دو چار دن کی بات ہے الیکشن سے قبل وہ یہ کہتے تھے پاکستان لیکے رہیں گے۔ اور اب کہتے ہیں لے لیا۔ ہوگیا نا افسانہ پورا۔ اتنے میں ایک صاحب نے دروازے سے گردن نکال کر

اندر کی طرف جھانکا۔

آئیے۔ آئیے۔ آئیے۔ وہ ایک ساتھ اتنے لوگوں کی گرویدگی سے گھبرا گئے اس راشننگ کے زمانہ میں سوٹ بھی بہت قیمتی پہنے ہوئے تھے۔ اور جسے ان کا جسم ٹھیک طریقہ سے ہضم نہیں کر رہا تھا۔ بجنسہ جیسے اس گرانی میں کسی کو ہیضہ ہو جائے مصافحہ ہوا۔ اور پھر اس نو وارد کے لئے کافی منگائی گئی۔

آپ یہاں روز آتے ہیں۔ اس نے اپنی ٹائی کی بو کو ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مگر شاید آپ کا یہ پہلا اتفاق ہے۔ عجیب و غریب جگہ ہے۔ یہاں آپ کو افسانہ نگار، شاعر، آرٹسٹ دائیں بائیں بے شمار ملیں گے۔ تھوڑے سے افسردہ پریشان حال۔ مخصوص اڈوں پر ہر جگہ آپ کو بیٹھے ہوئے ملیں گے۔

"مجھے تو آپ بھی کوئی شاعر معلوم ہوتے ہیں؟"

"میں جمہوری ہوں۔"

"اوں ہوں۔ آپ سے ملنے کا بیحد اشتیاق تھا۔ جمہوری صاحب! اس نے ذرا ہنس کر اپنے سوٹ کی طرف پھر دیکھا۔ جمہوری صاحب ایک کرتے پر نہرو کٹ واسکٹ پہنے ہوئے بظاہر نووارد کے بیش قیمت سوٹ سے بے نیاز بیٹھے ہوئے مسکراتے رہے کافی کا دور چلتا رہا۔ دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سوٹ اور نہرو کٹ واسکٹ آپس میں ہم کلام ہیں۔

"یہ سب ذرہ نوازی ہے" جمہوری نے اپنی بنڈی کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کا نام؟"

"مجھے فاروقی کہتے ہیں۔ اسی سال یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے۔"

"خوب ــــ آپ چلئے اُس سامنے والے گروہ میں چل کر بیٹھا جائے۔ وہاں اور بھی شاعر اور افسانہ نگار موجود ہیں۔"

بوائے نے بل پیش کیا۔ جمہوری نے اب تک جن لوگوں کا فی پلائی تھی۔ ان سب کی مجموعی قیمت ایک روپیہ سات آنے تھی۔

"ون سیون" "گڈ گاڈ"

"میں پیش کرتا ہوں" فاروقی نے جیب سے بٹوہ نکال کر کہا۔

"مگر آپ تو میرے مہمان ہیں" جمہوری نے بھی اپنی بنڈی کی جیب کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔

"وہ ایک ہی بات ہے" اور یہ کہہ کر فاروقی نے تھال میں پیسے ڈال دیئے

بوائے چلا گیا۔ بغیر سلام کئے ہوئے۔

"دیکھئے" جمہوری نے مسکرا کر کہنا شروع کیا "آپ نے شاید بوائے کو ٹپ نہیں کیا۔ معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے بنڈی سوٹ پر طنز کر رہی ہو۔ اگر آپ یہاں بیٹھ کر کافی پئیں تو اس جگہ کے آداب بھی سیکھیں۔ بوائے کو دو چار آنے ٹپ ضرور کئے جاتے ہیں۔ ورنہ آپ ٹپ ٹاپ کہلانے کے مستحق نہیں ہو سکتے۔"

"ٹپ ٹاپ" فاروقی نے اپنے سوٹ پر ایک نظر ڈال کر پھر جمہوری کی طرف دیکھا

"جی ہاں ٹپ ٹاپ۔ مہذب تو آدمی برسوں میں بنتا ہے۔ مگر ٹپ ٹاپ کچھ پیسوں میں ہو جاتی ہے۔" جمہوری نے ہنس کر پھر اُسی بوائے کو آواز دی۔ وہ بہت بیدلی کے ساتھ قدم اُٹھاتا ہوا قریب آیا۔

"صاحب کو سلام کرو۔ یہ تمہیں ٹپ کرنا بھول گئے ہیں۔"

"سلام حضور!" بوائے نے چاندی کی ایک چھوٹی سی چونّی مٹھی میں دبا کر کہا۔ اور چلا گیا۔

وحید حسب معمول اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا۔ جمہوری بھی فاروقی کو لے کر اس گروہ میں شامل ہو گیا۔

"ہیلو!" یہ لفظ بجائے خوش آمدید کے عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔"
اور پھر جمہوری نے فاروقی کو ایک ایک سے ملایا۔

"مسٹر وحید۔ اس شہر کے بہت بڑے رئیس زادے۔ مسٹر موہن سنگھ کرتال ہندوستان کے مشہور آرٹسٹ۔ دین دیال صاحب ملک کے مشہور افسانہ نگار اور آخر میں اس نے تمام لوگوں کو مخاطب کر کے کہا: "مسٹر فاروقی انتہائی محبت نواز دوست۔ اتفاق سے آج ہی آپ سے نیاز حاصل ہوا۔"

اس ہنگامے کے بعد پھر سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے
آپ لوگ کچھ پئیں گے۔ وحید نے اپنا فرض ادا کرنا چاہا۔

"کیا پئیں؟" جمہوری نے بیدلی سے کہنا شروع کیا۔ یہاں سوائے کافی کے اور ہے ہی کیا؟"

میرا روئے سخن فاروقی صاحب کی طرف تھا۔ آپ نے بولنے کی بیکار زحمت فرمائی۔

"جی میرا مزاج ذرا گرم واقع ہوا ہے۔" فاروقی نے اپنی ٹائی کو درست کرتے ہوئے کہا۔ چاء۔ قہوہ۔ کافی یہ سب چیزیں مجھے نقصان پہنچاتی ہیں۔"

"یہ گرم مزاج کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔" مجمع میں سے ایک صاحب بولے۔

"امتحاناً نوش کیجئے۔" وحید نے ہنستے ہوئے فاروقی سے کہا۔ میں نے بھی سنا ہے کہ چاء اور کافی۔ گرمیوں میں ٹھنڈک اور سردیوں میں گرمی پہنچاتی ہیں۔"

"میں نے کبھی اس فلسفہ پر غور نہیں کیا۔" فاروقی نے جواب دیا۔

"یہ تو بہت آسان سی بات ہے۔" جمہوری بولے "ہندوستان موسمی لحاظ سے لوہے کی طرح سخت ہے۔ جاڑا۔ گرمی۔ برسات انتہائی شدت کے ساتھ یہاں پڑتے ہیں۔ لہذا عقلمند وہی ہے جو گرمیوں میں گرم چیزیں اور سردیوں میں سرد چیزیں استعمال کرے۔ مثلاً آج ہی میں نے ایک صاحب کو کولڈ کریم کھاتے ہوئے دیکھا۔ آپ صاحبان یقین مانیئے کہ انہیں کولڈ کریم کھاتے ہوئے دیکھ کر میرا جسم کپکپانے لگا۔ اس غضب کی سردی اور کولڈ کریم؟ آخر کار میں ان کے پاس گیا اور اس وقت مجھے یہ پتہ چلا کہ جناب کو نزلہ بھی ہے۔ شاید وہ میرے آنے کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ لہذا پہلے انھوں نے رومال نکال کر اپنی ناک رگڑی۔ پھر بولے

"لوہا لوہے کو کاٹ رہا ہے۔"

جمہوری اور فاروقی کے آنے سے کافی کا دوسرا دور شروع ہوا۔

"اور وہ تمہاری نظم پوری ہو گئی؟" وحید نے پوچھا۔

"آخری حصہ باقی ہے۔ کیا بتاؤں ان اڈیٹر صاحب نے کسقدر پریشان کر رکھا ہے۔ آج ان کا تار بھی ملا۔ رسالہ منظرِ عام پر آنے کے لئے رُکا ہوا ہے۔ یہاں سے جا کر کسی نہ کسی طرح نظم تیار کروں گا۔ اور پھر کل تار کی صورت میں مسوّدہ روانہ کر دوں گا۔"

"ترکیب اچھی ہے۔ تار کا اس سے زیادہ صحیح مصرف اور کیا ہو سکتا ہے" وحید نے

ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو بڑا جاہل ہوں ہر قسم کی شعریت سے بہت دور۔ تم شاعر ہو" پھر اس نے موہن سنگھ کرتال کی طرف دیکھ کر کہا "تم ایک آرٹسٹ" دین دیال کی طرف اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ "یہ افسانہ نگار" اور یہ بزرگ" اُس نے ایک ادر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "بے شمار کتابوں کے مصنف۔ مگر میں کچھ بھی نہیں ہوں"

دین دیال نے اپنی کرسی کھسکا کر کہا۔ "تم ہم سب کا مجموعہ ہو۔ جو تم ہو وہ ہم میں سے کوئی نہیں ہے۔ تمہاری کار باہر کھڑی ہے۔ تم سرمایہ دار ہو۔ تم ہمیں کافی پلاتے ہو۔ تمہاری زندگی کے لئے میں افسانہ نگار ہوں۔ موہن آرٹسٹ۔ جمہوری شاعر۔" "یہ سب تمہاری محبت ہے۔ بلکہ افسانہ نگاری" وحید ہنسنے لگا۔ کس قدر چھچھوری باتوں پر اُتر آئے۔ انسان کے لئے صرف روپیہ ہی باعثِ مسرت نہیں ہوا کرتا کیا خیال ہے تمہارا موہن؟"

"مجھے تمہارے خیال سے اتفاق ہے۔ مگر یہ آرٹ بھی جس کے تم مالک ہو۔ روپیہ اور مرتبہ تمام چیزوں پر حکمران ہے۔ یہ غلط ہو یا صحیح مگر ہم اسے ماننے کے لئے مجبور ہیں"

"معلوم نہیں کیوں!؟" وحید نے کبیدہ خاطر ہو کر کہا "ادیب خوشحال نہیں ہوتے۔ خوشحال سے میرا مطلب امارت یا غربت نہیں ہے۔ بلکہ ان کی اپنی زندگی۔"

"زندگی تو عام طور پر امیر ہوتی ہے" جمہوری بولا "ہر شاعر انتہائی بے حس زندگی سے بے نیاز۔ اور لاپروا۔ حالانکہ زندگی کی قدریں اس کی نگاہ میں زیادہ ہیں۔ وہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ حساس واقع ہوا ہے"

"اور میرے خیال میں ان تمام باتوں کو شاعر یا افسانہ نگار کے نام سے غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔" دین دیال نے اپنا پہلو بدل کر کہنا شروع کیا۔

"نہ وہ صحیح معنوں میں زندگی کی قدریں پہچانتا ہے۔ اور نہ بہ نسبت دوسروں کے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ بلکہ وہ تو انتہائی پسند بھولا۔ بھالا۔ بیوقوف اور زمانہ کی روش پر چلنے والا۔ وقت کا محتاج۔"

"یہ سب کچھ تم کہہ رہے ہو" وحید کو تعجب ہوا۔

"ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ آج میں تمہارے سامنے اپنی اصلی شکل میں آجانا چاہتا ہوں۔ میں نے افسانہ نگاری چھوڑ دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کی صرف انفرادیت کوئی اچھی چیز پیدا نہیں کر سکتی۔ تاوقتیکہ اس کے پاس دولت۔ اطمینان اور خوشیاں نہ ہوں تم مجھ سے کہیں بہتر افسانہ نگار بن سکتے ہو۔ تم ایک چیز کو مجھ سے بہتر سوچ سکتے ہو۔ تمہارے لئے دنیا کے شراب خانے کھلے ہیں۔ تم خوبصورت لڑکیوں سے نہیں بول سکتے ہو۔ اس دنیا میں تمہیں اس سے زیادہ اور کیا چاہیئے۔ ہندوستان کے ہر شاعر اور افسانہ نگار کے لئے صرف دو موضوع ہیں۔ عشق اور روٹی۔ یا وہ کسی کا عاشق ہے یا بھوکا۔ عشق اور غربت — یہ دونوں کسی چیز کے نہ ملنے کے دوسرے نام ہیں تمہیں یہ دونوں چیزیں مل گئیں۔ اس لئے نہ تم افسانہ نگار رہو۔ اور نہ شاعر۔"

"یہ تم کس طرح کہتے ہو دین دیال!" جمہوری کو غصہ آگیا۔

"مجھے بحیثیت ایک شاعر کے تمہارے خیالوں سے اختلاف ہے مجھے دیکھو میں اپنی غربت میں مست ہوں۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا۔ میرے پاس بھی ایک فن ہے جس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔"

دین دیال ہنسا۔ جس طرح جہاں دیدہ لوگ بچوں کی باتوں پر ہنس دیتے ہیں ۔۔ کس وقت کی باتیں کر رہے ہو۔ اس ترقی پسند زمانہ میں جبکہ دنیا خدا سے زیادہ مادہ کی طرف راغب ہے وہ وقت باور تھا۔ اب تو آب و ہوا بدل چکی ہے۔ یہاں چاہ گرمیوں میں ٹھنڈک اور جاڑوں میں گرمی پیدا کرتی ہے۔ ہندوستان میں یہ فریب حقیقت سے بدل گیا۔ اس وقت نہ چاہ تھی نہ کافی۔ ہر شاعر حسب خواہش شراب میں ڈوبا رہتا تھا۔ درباری شاعری تصوف کی شاعری عشق کی شاعری۔ بھوک کی شاعری کا کہیں نام و نشان نہیں ملتا۔ تمہارا ہر نیا اور اچھوتا خیال ۔۔ پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ کہ تمہارے پاس روٹی نہیں۔ کپڑا نہیں۔ شراب نہیں، دل بہلانے کے لئے خوبصورت لڑکیاں نہیں۔ اور نہیں تو میری طرح تم بھی شاعری سے توبہ کر لو۔ یہ خاموشی اپنی غربت کا احترام ہے"

"مگر مجھے تو تمہاری کسی بات سے اتفاق نہیں" جمہوری کہنے لگا "یہ تمام باتیں تمہارے سچے احساس کا نتیجہ نہیں۔ تم نے ہماری غربت کو انتہائی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ اور مجھے تمہارے اس جذبہ کی قدر ہے"

"یعنی میری باتوں سے اتفاق بھی نہیں اور جذبہ کی قدر بھی کرتے ہو۔ کیا خوب! کل کا ایک واقعہ سنو۔ میڈیکل ہسپتال سے کل کسی آدمی کو صحت کے بعد خارج کر دیا گیا وہ بالکل تندرست ہو چکا تھا۔ مگر باوجود اس کے وہ اسپتال سے جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اسپتال کے ڈاکٹروں نے اُسے زندگی بخش دی تھی۔ اور یہ سب سے بڑا ظلم تھا جو اس کے ساتھ روا رکھا گیا۔ ہندوستان میں زندگی دینے والے تو بہت ہیں مگر روٹی دینے والا کوئی نہیں۔ تم لوگ زندگی ہی تو دیا کرتے ہو نا؟"

جمہوری جواب دینا چاہتا تھا مگر قریب ہی سے کچھ لوگوں کے لڑنے جھگڑنے

کی آوازیں آنے لگیں کیپٹن زمرد کسی سے چلا چلا کر کہہ رہے تھے "میں فوج کا کپتان ہوں۔ میں فوج کا کپتان ہوں۔"

دوسرے صاحب کوئی سیاسی لیڈر تھے اور وہ کہہ رہے تھے "ہندوستان ہمارا ہے ہم آزادی لیں گے ہم حکومت کرینگے۔" کس قدر مختلف خیالوں کی لڑائی تھی یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ انسان انسان سے لڑ رہا ہے۔ نہ وکٹ ہنڈی اور وردی کی لڑائی تھی۔ وحید اور اس کے ساتھی شاعر۔ افسانہ نگار، آرٹسٹ۔ اور دوسرے مہمان اس جھگڑے کی طرف بڑھے۔ معلوم ہوا کہ دونوں شراب کے نشہ میں چور ہیں۔

تماشائیوں میں سے کسی نے کہا "لوہا لوہے کو کاٹ رہا ہے۔"

یہ جھگڑا ایک لڑکی کی وجہ سے شروع ہو گیا تھا۔ جوان دونوں کے ساتھ تھی اور جسے دونوں اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتے تھے۔

وحید نے لڑکی سے پوچھا "تم ان دونوں میں سے کس کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

لڑکی نے نگاہیں جھکا کر کہا۔ "شاید آپ نے بھی مجھے وہی سمجھا جو ان دونوں کو سمجھ رکھا ہے۔"

"معاف کیجئے پھر کون ہیں آپ؟" وحید کے لہجہ میں انتہائی شرافت آگئی۔

لڑکی کہنے لگی "مجھے بچپن سے کہانیاں لکھنے کا شوق ہے۔ چنانچہ ان دنوں جو کہانی لکھ رہی ہوں۔ اُس کا عنوان ہے "شرابی" مجھے اُمید ہے وہ کہانی آج ہی رات کو پوری ہو جائے گی۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہانی انہی دو کیریکٹروں پر ختم ہو جائے گی۔ مگر اب اس میں ایک کیریکٹر اور بڑھانا پڑے گا۔

اتنے لوگوں کی آمد پر جھگڑا ختم ہو گیا۔ لڑکی بھی وحید کے گروہ میں آکر شامل ہو گئی

پھر جب سب لوگ پہلے کی طرح اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ تو وحید بولا۔

"میرا خیال ہے اس ملک میں صرف لڑکیوں کو افسانہ نگار یا شاعر ہونا چاہیئے تھا۔" کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے دین دیال کی طرف مڑ کر دیکھا۔

"صحیح ہے۔ مجھے تمہارے ہر خیال میں زندگی نظر آتی ہے۔ یہ محترمہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ بلکہ بذاتِ خود ایک افسانہ!"

"ہشت! مجھے تمہارا یہ خیال بھی پسند نہیں۔" جمہوری بولا۔

"ہر لڑکی بذات خود ایک رنگین شعر ہے۔ افسانہ نہیں۔"

موہن سنگھ کرتال جو اپنے کاغذ پر لڑکی کا اسکیچ بنا چکا تھا پیش کرتے ہوئے بولا "میرے خیال میں ہر لڑکی ایک خوبصورت تصویر ہے۔"

فاروقی ایک مرتبہ پھر صرف اپنی خوبصورت ٹائی کی بو کو ٹھیک کر کے رہ گیا

اب وحید کی باری تھی۔ اس نے کہا "اور میرے نزدیک ہر لڑکی ایک خوبصورت خواہش ہے ......

"مگر یہ سب کچھ تو تصویر کا ایک ہی رخ ہے۔" لڑکی نے بیچ میں بات کاٹ دی۔" اس تصویر۔ اس شعر اور اس افسانہ میں کس قدر رنگین زندگی ہے۔ کس قدر خوبصورت نقش ہیں۔ مگر تصویر کا دوسرا رُخ ——؟"

"اس تصویر کا کوئی دوسرا رخ نہیں ہوا کرتا۔" سب نے یک زبان ہو کر کہا

بات ختم ہو گئی۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ یہ لوگ کافی ہاؤس سے اُٹھ کر مال روڈ کی تنہا اور سنسان سڑک پر چلنے لگے۔ مہذب آبادی ختم ہو گئی۔ جمہوری اور فاروقی ایک ساتھ قدم ملائے جا رہے تھے۔

"لڑکی خوب تھی" جمہوری بولا۔

"افسانہ نگار تھی۔ مگر اُس تصویر کے دوسرے رخ پر کسی نے روشنی نہ ڈالی"

اتنے میں کسی سایہ نے حرکت کی۔ وہ پرچھائیں کی طرح ان دونوں کے ساتھ ساتھ رینگتا رہا۔

ندامت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز آئی "نواب صاحب! اجی نواب صاحب"

فاروقی نے کہا۔ "بھائی! میں اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا چاہتا تھا۔ کل پھر ملوں گا کافی ہاؤس میں۔"

اس سایہ نے یہ کہا۔ "آیئے میں دکھاتا ہوں۔ اگر پسند ہو تو رہ جایئے گا ——"

بدنام گلیاں

مجھے وہ گلیاں زندگی میں کبھی نہیں بھول سکتیں۔ شہر کی گنجان حد میں ایک عام گذرگاہ کے کنارے سے گلی شروع ہوتی تھی۔ نکڑ پر ایک پان والے کی دوکان تھی۔ قاعدہ یہ تھا کہ گلی میں جانے والا پہلے اس دوکان کے سامنے کھڑا ہو کر اپنے لئے ایک بیڑا پان لگواتا۔ ایک سگرٹ لے کر سلگاتا اور پھر دھیمے سے سب کی نظریں بچا کر گلی کے اندر رینگ جاتا۔ اور پھر گلی در گلی لاتعداد جھونپڑوں اور بوسیدہ مکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اگر اس وقت اندر داخل ہونے والے پر کسی کی نظر نہ پڑے تو پھر اُسکو یہ گلیاں اپنے اندر ہضم کر لیا کرتی تھیں۔ جانے والے کو یا تو کوئی ساز کھینچ لیتا یا کوئی نسوانی سی حسین آواز۔ اِن گلیوں میں جانے والے بھی مختلف عمروں کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ مثلاً نوجوان۔ ادھیڑ اور اکثر بوڑھے۔ گلیاں بھی عمر کی مطابقت سے زندگی کے اُن ہی حصوں میں بٹ گئی تھیں۔ ابتدا بوڑھی گلی سے ہوتی تھی اور اِس خطہ میں رہنے والی تمام عورتیں بوڑھی تھیں

پھر ادھیڑ گلی شروع ہو جاتی - جوانی اور بڑھاپے کے درمیان کی عورت اِس گلی میں مل جاتی - اور جہاں سے جوانی کی حدیں شروع ہوتیں اُسکا نام جوان گلی تھا - یہاں کم سن لڑکیاں تھیں نوعمر جوانیاں اور شباب تھا - یہاں روشنی اور رونق بھی تھی - رقص اور نغمہ بھی تھا اور معلوم یہ ہوتا تھا کہ دونوں گلیوں کی سوئی ہوئی زندگی یہاں اِک دم سے جاگ پڑی ہے -

میں ان گلیوں میں نووارد کی حیثیت سے داخل ہوا - دبے دبے قدموں سے پہلی دونوں گلیاں پار کرنے کے بعد جس وقت میں نے تیسری گلی میں قدم رکھا تو وائلن کی نغمہ ریز آواز میرے کانوں میں آئی - ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں ایک لالٹین جل رہی تھی اور وائلن کی دھن پر گھنگروؤں کی آواز نے میرے قدموں کو پکڑ لیا - اندر سے ایک حسین آواز آئی -

"تشریف لے آئیے -

اندر گیا تو لڑکی رقص کرتے کرتے تھک کر فرش پر بیٹھ گئی مگر وائلن کا نغمہ جاری رہا - یہ نغمہ اور رقص کچھ اسقدر ہم آہنگ تھے کہ مجھے وائلن کی وہ دھن بغیر گھنگروؤں کی آواز کے بے کیف سی معلوم ہونے لگی - میں نے لڑکی سے مخاطب ہو کر پوچھا -

ناچ بند کیوں کر دیا ؟

صبح سے یہ وقت ہو گیا ناچتے ناچتے تب کہیں جا کر ایک گاہک ملا - ہمارا ناچ نہ آنے والوں کے لئے جاری رہتا ہے - آپ آ گئے اسلئے ناچ ختم ہو گیا

مگر میں تو رقص ہی دیکھنا چاہتا تھا۔

تعجب ہے۔ لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی۔ آپ اس مصنوعی ناچ سے خوش ہوئے اور اب اگر زندگی رقص کرنے لگے تو اُسے آپ پسند نہ کریں گے۔

جواب میں بلا کی خوش مذاقی تھی۔ اِس لئے میں بھی اس کی طرف دیکھ کر ہنسا۔ لڑکی قبول صورت تھی۔ گورا رنگ۔ سڈول جسم۔ ناک ونقشہ غنیمت میں نے خود کو اپنی خواہشوں کے سپرد کر دیا۔

تم گانا بھی جانتی ہو؟

ناچنا اور گانا میرا پیشہ نہیں ہے۔

لڑکی میری طرف دیکھ کر پھر مسکرائی۔ مگر مجھے حیرت تھی کہ اگر ناچنا اور گانا اِسکا پیشہ نہیں ہے تو پھر اس نے مجھے آنے کی دعوت کیوں دی میں نے اپنے سوال کو پھر وضاحت سے دھرایا۔

یہ پیشہ نہیں ہے تو اِس بدنام گلی میں رہتی کیوں ہو؟

یہ ایک لمبی داستان ہے۔ لڑکی کہنے لگی۔ اور گھوم کر اس نے اس وائلن بجانے والے کی طرف دیکھا جو بیٹھا ہوا اپنے تاروں کو چھیڑ رہا تھا۔ اُس نے اثبات میں اپنی گردن ہلائی اور لڑکی کو داستان بیان کرنے کی اجازت دیدی۔

میں اپنی بپتی سنانے سے پہلے آپ سے کچھ پوچھ سکتی ہوں؟

پوچھو۔

وہی سوال جو آپ نے مجھ سے کیا تھا میں آپ سے کرتی ہوں۔

کیا پیشہ ہے آپ کا؟

کتابیں لکھتا ہوں۔ قصّہ کہانیوں کی۔

لڑکی ہنسنے لگی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ مجھے بیوقوف سمجھ کر میرا مذاق اڑا رہی ہے۔ مجھے خود بھی اپنے پیشہ کے اظہار پر ندامت ہونے لگی۔ پیشے بہت سے بتلائے جا سکتے تھے۔ مثلاً ملازمت۔ تجارت۔ یا زراعت مگر میں نے غلطی سے حقیقت بیان کردی۔ میرا یہ پیشہ جس کا نام نشر و اشاعت ہے۔ اس ملک میں کچھ اسا بے معنی سا ہے کہ اسکی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔

کتابیں لکھنے سے فائدہ کیا ہوتا ہے؟ جھوٹی سچی کہانیاں پڑھ کر لوگ کیا کرتے ہیں؟

جو چیز تم ناچنے کے بعد حاصل کرتی ہو وہ میں کہانی لکھنے کے بعد۔ ہمارے پیشوں کی خاصیت ایک ہے نام بدل گئے ہیں مگر تم مجھے اپنی کہانی سناؤ.....

لڑکی پھر کھڑی ہو کر ناچنے لگی۔ وائلن پھر اسی طرح بجنے لگا۔

قدموں کی ہر جنبش سے اسکی اپنی زندگی کی ایک کہانی مرتب ہو رہی تھی گھنگرو بول رہے تھے۔ یہ قدم ایک شریف گھر میں پلے بڑھے۔ انہیں عزت کے راستہ پر ڈالا گیا۔ ان میں لغزش پیدا ہوئی۔ پھر یہ قدم وائلن کی آواز پر اُٹھے، اور نغمہ کا تعقب کرنے لگے۔ قدم اُٹھتے رہے۔ وائلن بجتا رہا اور آخر کار اب قدموں نے بدنام گلیوں کا رُخ اختیار کیا۔ لڑکی نے ناچتے ناچتے پھر ایک دفعہ مڑ کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگی۔

ناچنا گانا میرا پیشہ نہیں ہے۔ وائلن کی اس آواز پر رقص کرنے کی عادت ہے

میں سب کچھ سمجھ گیا - عجیب کہانی تھی جو آج تک الفاظ کا جامہ نہ پہن سکی - مجھے معلوم ہوا کہ میں بدنام بستی کے اندر کسی ایسے مقدس مقام پر بیٹھا ہوں جس کا آج تک کوئی پتہ نہ لگا سکا -

حیاتِ لیاقت

شہید ملت لیاقت علی خاں وزیر اعظم پاکستان کے مستند حالات و سوانح کا سبق آموز مجموعہ۔ شہید ملت کے حادثۂ قتل کی خوں فشاں داستان۔ شہید ملت کی سوگوار قوم کے نوحۂ ماتم کا اشک آفریں مُرقع۔!

یہ کتاب ہر پاکستانی کے لئے شمع راہ کا کام دے سکتی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت شہیدِ ملت رح نے کس طرح اپنے خونِ جگر سے چمنِ پاکستان کی آبیاری کی؟ کن مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا؟ کس طرح ایک بکھری ہوئی قوم کو منظم و متحد کر دیا۔ یہ صرف شہیدِ ملت کی سوانح عمری نہیں بلکہ ملتِ پاکستان کے تابندہ عزم و حوصلہ کی روداد بھی ہے نیز نایاب تصاویر کا بہترین البم۔ کتاب کی ترتیب و تالیف ملک کے مشہور اہل قلم جناب رئیس احمد جعفری نے کی ہے، اور یہ نام کتاب کے بلند پایہ ہونے کی بہترین ضمانت ہے۔

قیمت پاکستانی سکہ چھ روپے چار آنہ۔ قیمت ہندوستانی سکہ آٹھ روپے

ناشر:- **اودھ کتاب گھر**

پوسٹ بکس نمبر ۴۴، کچہری روڈ کراچی ۱

ہندوستان میں ملنے کا پتہ

نسیم بکڈپو نمبر ۲۵ لاٹوش روڈ لکھنؤ

دیواریں گر گئیں

مجلس کے یوں تو بہت سے مقامات خالی تھے - مگر دو چار جگہیں ایسی تھیں جہاں سے بار بار نگاہیں اٹھ کر لوٹ آتی تھیں، اِن جگہوں پر بیٹھنے والے ہجرت کر گئے تھے لیکن نگاہوں کو دھوکا ہو جاتا - جج صاحب ہمیشہ سامعین کے جوتوں کے پاس بیٹھ جاتے وہ عموماً مجلس شروع ہونے کے بعد آتے تھے، وہ اپنی منصف مزاجی کی بنا پر اپنے کو سزا دینے کے لئے ہمیشہ جوتوں کے پاس بیٹھ کر ذاکر کی طرف متوجہ ہو جاتے - ایک قصبہ میں اتنی بڑی شخصیت کا مالک - ظاہر ہے کہ لوگ مجلس کا احترام بھول کر ان کو عزت دینے کی فکر کرنے لگتے مگر وہ ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیتے - مجلس اور ذاکر دونوں کے احترام کے خیال سے زبان بند رکھتے اُن کی بیگم بھرپور معنویت کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا کرتی تھیں - صدر اعلیٰ بیگم کا بھی ایک مقام تھا - ادھر اُنکی نگاہیں کسی شریر اور الھڑ لڑکی پر اُٹھیں اور وہ زانو تہ کر کے خاموش بیٹھ گئی -

امام باڑہ کے سفید سفید فرش پر ادھر اُدھر تمام لوگ جو محرم کے دنوں میں باہر سے ہر سال آیا کرتے تھے کالی سرخ کی شیروانیاں اور سفید اور یہی پائجامے پہنے ہوئے آتے

اور مجلس کی زینت بنتے۔ پورے سال بھر کے بعد یہ دن آتے تھے اور تمام اعزا ایک ساتھ مل کر بیٹھتے۔ قصبہ کی زمین، امام باڑوں کی دیواریں، سفید سفید فرش ان پر ناز کرتا۔ اِدھر اُدھر دیہاتی نما لوگوں کا مجمع ہوتا۔ روئی کی موٹی موٹی بنڈیاں پہنے۔ کاندھوں پر جولاہے کے بُنے ہوئے بڑے بڑے رومال ڈالے۔ جس وقت وہ اپنے دیسی چمڑے کے بنے ہوئے جوتے اُتار کر ان کالی کالی شیروانیوں اور دودھ کی طرح دُھلے ہوئے پائجاموں کے پاس آکر بیٹھ جاتے تو مہذب اور تعلیم یافتہ لوگ اپنی ناکوں پر رومال لگا لیتے ان دیہاتیوں کے پیروں سے ایسی بُو آتی کہ مجلس کا سلگتا ہوا لوبان اور اگر بتی اپنی بھینی بھینی خوشبو کھو دیتا۔ مگر ان دیہاتیوں کو کبھی اس کا احساس نہیں ہوا۔ وہ بڑی سادگی اور معصومیت سے آکر اپنے بھانجوں اور بھتیجوں کے کاندھے سے کاندھا ملا کر بیٹھتے۔ فیشن ایبل لونڈا ر بھانجا بہت ادب سے سلام کرتا اور وہ بزرگ دل سے دعاؤں کا انبار نکال کر اس پر ڈال دیتے۔ اِدھر اُدھر سے کوئی بھتیجا بول اُٹھتا "چچا آداب" اور وہ بزرگ پھر اپنی بسم اللہ شروع کر دیتے "زندہ رہو، خوش رہو، آباد رہو۔ عہدہ بڑھے، گھر میں چاند سی بہو آئے۔" ان سلاموں کی یہ دیہاتی اتنی عزت کرتے تھے۔ ایسی گرمجوشی سے جواب دیتے تھے کہ ان کے انداز میں فقیرانہ لہجہ آجاتا تھا۔ بیچارے عہدوں اور شخصیتوں سے بھیک ہی تو مانگتے تھے۔ کوئی اپنے لڑکے کی خاطر کہ اس کے میٹرک پاس لڑکے کو دفتر میں جگہ مل جائے۔ کوئی اپنی لڑکی کی خاطر جس سے یہ کالی کالی یہ سرخ کی شیروانیاں تفریحاً ہنستی بولتی تھیں اور لڑکیاں تو لپٹ لپٹ جاتی تھیں۔ کوئی۔ آئی۔ سی۔ ایس کوئی پولیس کپتان کوئی اور آفیسر ان سے ہمکلام ہوا اور وہ لپٹ گئیں۔ ساری برادری میں ہلڑ مچ گیا

زہے نصیب۔ لڑکی کے ہاتھ جنت آگئی، اسی وقت سے وہ سہانے سہلانے خواب دیکھنے لگی۔ خدا کی قدرت سے تو کوئی چیز بعید نہیں اور پھر ان لڑکیوں میں بجز غربت کے اور کس چیز کی کمی ہے؟ سچا دودھ اور گھی کھا کھا کر ایسا رنگ روپ نکالتی ہیں کہ خدا کی پناہ، پھر بعض بعض تو خدو خال میں بھی خوبصورت ہوتی ہیں اور اس پر سوگوار شباب گورے گورے چہروں پر کالے دوپٹے ایسے بھلے معلوم ہوتے ہیں جیسے سیاہ بادلوں سے چاند نکل آیا ہو۔

انسری، زبیدہ، اور ثریا اپنی ہمجولیوں میں سب سے خوبصورت لیکن ان تینوں کی نظر انتخاب میں دو ہی لڑکے تھے انور اور جمال اور اتفاق سے یہ دونوں ہجرت کر گئے انتہائی جامہ زیبی کے ساتھ یہ دونوں کالی سرخ کی شیروانیاں اور سفید اور یہی پائجامے پہن کر مجلس میں آکر بیٹھے یوں تو ان دونوں کو ساری بستی کی لڑکیاں گھور گھور کر دیکھتی تھیں۔ مگر مقابلہ ان تینوں ہی لڑکیوں میں تھا۔ جسدن جو صاحب جس لڑکی سے ذرا ہنس کر بولے وہ بازی جیت گئی۔ امسال محرم میں بادلوں کے درمیان یہی سب چاند تھے مگر انور اور جمال کا پتہ نہ تھا۔ یہ دونوں اپنے عہدوں کے ساتھ دوسرے ملک چلے گئے۔ مجلس میں انور اور جمال کی جگہوں کو یہ لڑکیاں دیکھتیں اور ان کی نگاہیں ناکام واپس لوٹ آتیں۔ امسال محرم میں کوئی نہیں آیا۔ نہ جج صاحب کی بیگم آئیں اور نہ صدا علی کی بیگم نے اس بستی کا رُخ کیا، انور اور جمال بھی انسری زبیدہ اور ثریا کو بھول کر کنارہ کش ہو گئے۔ بادلوں میں چاند نکل کر چھپ جاتا۔
رہ گئے بیچارے غریب، ان کے لئے نہ بادلوں میں کیف تھا نہ چاند میں۔ یہ سورج چاند اور ستارے غریبوں کے گھر میں طلوع ہو کر انہیں کبھی کوئی مسرت نہ بخش سکے

اور پھر ان سب کے آنے کی دھوم بہت پہلے سے ہو جاتی تھی۔ تانگے بستی کے اسٹیشن سے بھرے ہوئے لوٹتے تھے۔ پردے بندھے ہوئے کسی پر صدر اعلیٰ کی بیگم اور انکی لڑکیاں۔ کسی پر جج صاحب کی بیگم اور ان کے لڑکے جج صاحب کے لیئے آٹھ کہاروں کی پالکی جاتی تھی۔ کسی تانگے پر انور اور جمال پائپ کا دھواں اڑاتے ہوئے اس چھوٹی سی بستی میں وارد ہوا کرتے تھے اور اس طرح ہندوستان کے ہر خطے سے اس بستی کے لوگ محرم میں آکر جمع ہو جاتے تھے۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے لوگ وکیل، بیرسٹر، پروفیسر، ڈاکٹر، حکیم۔ بستی کے تخم سے ہر قسم کا شجر پھوٹ نکلتا تھا ان سب کی آمد میں ایک گرم جوشی تھی وطن کی زمین پر قدم رکھتے ہی بستی کے آثار قدیمہ کو ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جیسے جنتا کے نقش و نگار ہوں، بستی شروع ہوتے ہی سب سے پہلے رجب فقیر کا ڈھا ہوا مکان ملتا تھا اس کے بوسیدہ چھپر پر کدو اور لوکی کی پھیلی ہوئی بیلیں دور سے دکھائی دیتی تھیں، کیسی عقیدت تھی اس رجب کے گھر سے، ایک سال کی لمبی مدت کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تاج محل نگاہوں کے سامنے آگیا ہو پھر تانگہ جیسے ہی اس کے مکان کے سامنے سے گلیارے میں ہو کر گذرتا تھا اس کے بچے تانگے کے ساتھ ساتھ دعائیں دیتے ہوئے دوڑنا شروع کر دیتے تھے صدر اعلیٰ کی ڈیوڑھی آباد رہے بیگم صاحبہ کی خیر، امام حسینؑ کی خیرات" اور صدر اعلیٰ کی بیگم اپنا اور لڑکیوں کا امام ضامن کھول کر دے دیتیں۔ کسی میں روپیہ نکلتا کسی میں چونی اور اکنی سے تو کم کبھی امام ضامن میں ہوتا ہی نہ تھا۔ محرم میں رجب فقیر کو اتنی خیرات مل جاتی تھی کہ وہ سال بھر بیٹھ کر کھاتا تھا۔ مگر اب یہ آنے والے

ہجرت کر گئے رجب فقیر کے بچے اب بھی تانگوں کی آہٹ پر دوڑ لے ہیں اور تانگے والے جھلا کر کہتے ہیں " آجاؤ گھوڑے کی ٹاپوں کے نیچے بدنصیبوں - خیرات کے دن ختم ہو گئے اب اس بستی میں کوئی نہیں آئے گا - اور یہ بچے بڑی نا اُمیدی کے ساتھ واپس لوٹ آتے ہیں -

جو لوگ ہجرت نہ کر سکے ان میں ایک راحت بھائی کا دم ہے - انہوں نے کبھی اس بستی کے باہر قدم نہیں رکھا - یہ بذاتِ خود اس مقام کا پورا تمدن ہیں محرم آتا ہے تو یہ ننگے سر اور برہنہ پا ہو جاتے ہیں - اوّل سے یہی کرتے چلے آئے ہیں اتنا بڑا انقلاب آگیا مگر یہ ویسے ہی رہے - مجلس میں یہ اپنی جگہ بیٹھتے ہیں روئی کی موٹی سی بنڈی پہنے - ایک جیب میں موٹا سا بٹوہ اور دوسری میں مجلس کا تبرک بھرے بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں مقامی لوگ تو ان کی کوئی خاص عزت نہیں کرتے مگر سال میں ایک مرتبہ آنے والے ان کو بڑی عزت دیا کرتے تھے - ان کے نزدیک راحت اس بستی کے زندہ آثارِ قدیمہ تھے اور انور اور جمال کا تو یہ حال تھا کہ دونوں کیمرے کے مختلف زاویوں سے ان کی تصویریں اتارتے گویا ایک نایاب موضوع ان کے ہاتھ لگ گیا ہو راحت بھائی مجلس میں بیٹھ کر روتے تو جمال کا کیمرہ سامنے ہوتا - پھر جب وہ جوش میں آکر ماتم کرتے تو انور کیمرہ لے کر کھڑا ہو جاتا غرضیکہ ان کا ہر انداز ان دونوں کو مرغوب تھا - پھر لوگوں کو راحت بھائی پر شک بھی ہونے لگا - آخر اس سودائی میں کیا خصوصیت ہے ؟ بیچارے اکثر شاعری ہی کرتے تھے - اور شنک تخلص تھا مگر انور اور جمال نے جب ان کی شاعری سُنی تو انہیں سنبھلے

اور کیٹس کا مزہ آگیا۔ بہت وقار کے ساتھ وہ اپنے اشعار سنانے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ لیکن امسال انکی یہ بیاض بند رہی۔ کس کا سر پھر اتھا تو جوان سے اشعار سنتا اور یہاں کے لوگ تو ہمیشہ انہیں سودائی کہتے آئے ہیں —— کسی نے کہدیا کہ روزانہ صبح اُٹھ کر بیت الخلا کو چالیس روز تک سلام کرو تو بہت سی دولت ملے گی، یہ بیچارے روزانہ یہی کرتے رہے، صبح اُٹھتے اور لوگوں کی نظریں بچا کر پہلے بیت الخلا کو مخاطب کرتے۔ پھر کہتے آداب عرض' ایک دن وہاں پہلے ہی سے کوئی رفع حاجت کے لئے گیا ہوا تھا۔ حسب معمول جب انھوں نے کہا آداب عرض تو اندر سے جواب آیا جیتے رہو۔ بس اُسدن سے یقین ہو گیا کہ دولت نے سرپرستی قبول کرلی۔ اس واقعہ کو کئی سال گذر چکے ہیں مگر عقیدہ اب تک قائم ہے' اسی عقیدہ کی بناء پر کسی سے مرعوب نہیں ہوتے' بڑے بڑے آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتے' اور یہ واقعہ انور جمال کی ڈائریوں میں نوٹ ہے۔ جیسے راحت بھائی کے منھ سے نکلے ہوئے یہ الفاظ کوئی بہت بڑا سرمایہ ہوں' مگر ان تمام باتوں کے باوجود یہ انور جمال سے کبھی جھک کر نہیں ملے۔ یہ حقیقتاً اپنے لفظوں کو اپنے اشعار کو ادبی سرمایہ سمجھتے رہے' خود اپنی شخصیت میں مست رہے —— اور اس بستی کے چھوٹے بچے جو مدرسوں سے نکلکر اپنے ہندو ساتھیوں کے ساتھ گاتے پھرتے ہیں "سنو سنو اے دنیا والو باپو کی یہ امر کہانی" ایک نئے تمدن کو جنم دے رہے ہیں۔ جو آگے چل کر راحت بھائی کا گلا گھونٹ دیگا۔ آج انور اور جمال اگر ان بچوں کو یہ گاتے ہوئے سنتے تو انہیں راحت بھائی پر کس قدر ترس آتا۔ اگر وہ ہوتے تو اپنے اس پرانے

تمدن سے لپٹ کر دو لتے مگر یہ دونوں جا چکے ہیں۔

دوسرا دم بیچارے مختار نانا کا ہے، اس بستی میں چراغِ سحری کی طرح یہ بھی ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ خود آپ اپنا کردار ہیں مجلس میں سرِ ممبر آکر جوانوں کیطرح اب بھی کھینچ کر مرثیہ پڑھتے ہیں۔ سارے گلے کی رگیں پھول جاتی ہیں، آواز بھی ضعف اور نقاہت میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے مگر اس کا احساس انہیں نہیں ہے، راحت بھائی کی طرح ان پر بھی محرم پوری آب و تاب کے ساتھ آتا ہے دُلدل کے نقیب بنکر ایسی دردناک صدا لگاتے ہیں کہ لوگوں کے دل دہلجاتے ہیں "سواری ہے شہید کربلا کی" یہ الفاظ جادو بنکر ان کی زبان سے نکلتے ہیں اور ساری فضا پر چھا جاتے ہیں، انور اور جمال کے لیے ان کی شخصیت بھی انتہائی معنی خیز تھی۔ یہ دونوں ان کا بڑا احترام کرتے تھے جب کبھی مختار نانا ان دونوں کو دیکھ کر بہت سی دعائیں دیتے تھے۔ اپنی ساری بزرگانہ شفقتوں کا نچوڑ وہ اُن پر سے نچھاور کر دیتے۔ مگر اب وہ بھی چپ ہیں۔ ہندوستان کب بٹا اور کس طرح بٹا یہ آج تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ موجودہ سیاست کو اس طرح تعجب اور ڈر سے بڑی بڑی آنکھیں نکال کر سنتے ہیں۔ جیسے کوئی بچہ پرستان کی کہانی سن رہا ہو انور اور جمال کے چلے جانے کے بعد اب وہ بچہ بن گئے ہیں کبھی اسکول کے بچوں کے ساتھ وہ خود بھی تالیاں بجا بجا کر گانے لگتے ہیں بے اختیاری طور پر ان کی زبان سے بچوں کی طرح "باپو کی امر کہانی" نکل پڑتی ہے، ہر بات سے سہم کر خاموش ہو جانا ان کی عادت بن گئی ہے معلوم نہیں یہ تبدیلی انہیں کیوں ہوئی ورنہ ایک زمانہ میں اپنی دلیری اور وضع داری کا ڈنکا بجوا دیا سنتے ہیں

کہ رات بھر درد گردہ کی شکایت میں تڑپا کرتے تھے - اور صبح اٹھ کر کمر میں پٹیاں کس لینے کے بعد اپنی بہن کا مقدمہ لڑنے دس کوس پیدل ضلع کچہری تک چلے جاتے - آج کی دنیا ایسے لوگوں سے خالی ہو چکی ہے اور اگر اب بھی وہ لوگ زندہ ہیں تو اسکول کے بچوں کے ساتھ گانے کے علاوہ ان کا کوئی کام نہیں بچے گاتے ہیں اور وہ تالیاں بجا بجا کر ان کا ساتھ دیتے ہیں اور بچوں کا ساتھ دیتے ہیں وقت کا ساتھ دیتے ہیں - زمانہ کا ساتھ دیتے ہیں اپنی بستی اور اسکے نئے تمدن کا ساتھ دیتے ہیں - انور اور جمال اس بستی کے دو خوش رو جوان جو کالی شیروانیاں اور سفید ادریسی پاجامے پہنکر ان کی بزرگانہ دعائیں لیتے تھے وہ ہجرت کر گئے وہ انور اور جمال جو شہری زبیدہ اور ثریا کی آنکھوں کے مد نظر تھے یہاں سے چلے گئے - وہ انور اور جمال جو راحت بھائی کو بستی کا زندہ آثار قدیمہ سمجھ کر ان کے سامنے جھک جاتے تھے روپوش ہو گئے تو بستی کی یہ منہدم دیواریں کیسے نہ گریں - راحت بھائی آتے ہیں اور امام باڑہ کے کسی کونے میں خود اپنے وجود سے بے خبر ہو کر بیٹھ جاتے ہیں نہ اب انہیں کوئی اچھا لگتا ہے اور نہ یہ کسی کو اچھے لگتے ہیں - ساری دنیا بدل گئی - مگر یہ نہ بدلے - آخر ان میں انقلاب کیوں نہیں آتا؟ اس تمدن اس آثار قدیمہ کو موت کیوں نہیں آتی اسکول کے خوش گلو بچوں کے آگے اب انکی بیاض کے اشعار کون سنے؟ تبرک والی جیب میں وہ بند بیاض اب بھی رکھی رہتی ہے - مگر انور اور جمال کون بنے؟ کس کا سہرا پھیرا ہے؟ راحت بھائی کا منھ پھولا رہتا ہے - وہ اکثر اپنی بیاض کو نکال کر غصہ کے ساتھ جیب میں رکھ لیتے ہیں مگر کون پرواہ کرتا ہے - انور اور جمال قدر دان تھے

انہیں راحت بھائی کا ہر انداز مرغوب تھا۔ ان سے زیادہ ان کے گیمرے میں ملاحت تھی مگر اب کیا کیا جائے؟ راحت بھائی آپ ہی آپ وقت سے لڑے جا رہے تھے۔ اسٹیشن سے آتے ہوئے خالی تانگوں کے ساتھ ان کی نگاہیں بھی دور تک جاتی ہیں۔ مگر زبان ہمیشہ خاموش رہی۔ انہیں تانگوں پر ایک سال قبل راحت بھائی کے کیسے کیسے قدر دان آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر لوگوں کو ایسی خوشی ہوتی تھی جیسے اپنی بستی کے غالب اور میر سے ملاقات ہو گئی۔ پردہ کے اندر سے لڑکیاں انہیں دھیمی آوازیں سلام کرتیں پھر ان کے کہے ہوئے کسی نئے نوحہ کا تقاضہ کرتیں اور راحت بھائی دعائیں دے کر باغ باغ ہو جاتے مگر اب صبح سے شام تک خالی تانگے لوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں اور اپنی بندیاض کو غصہ میں جیب سے نکال کر پھر اندر کر لیتے ہیں — "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" اور اب راحت بھائی سے جب کوئی لڑکی نوحہ مانگتی ہے تو وہ یہ کہہ کر بات ٹال دیتے ہیں کہ قدر داں نہ رہے علامہ اقبال کے اس ارشاد میں جو تڑپ ہے اس کا اظہار راحت بھائی کرتے ہیں اور آٹھویں محرم کو ساری بستی کے علم اُٹھتے ہیں کئی انجمنیں ماتم کرتی ہیں اور دور دور سے لوگ آ کر زیارت کرتے ہیں آج کے دن سپاہی اور دو ایک تھانیدار گلوں میں پستول لٹکائے ہوئے آ جاتے ہیں انتظاماً ہر سال ایسا کیا جاتا ہے پولیس کے کپتان اور آئی جی صاحب جو اس بستی کے محرم کرانے آیا کرتے تھے۔ پھر سپاہی اور تھانیداروں کا آس پاس پتہ نہ چلتا تھا۔ بیچارے دور دور رہتے تھے اور راحت بھائی تو اینڈے پھرتے تھے کیا مجال جو ان کے ننگے پیروں کے پاس کوئی سپاہی آ جائے۔ مجمع کے اندر جوتا پہن کر کوئی آ ہی نہ سکتا تھا۔ کہاں کا

انتظام کہاں کی پولیس بس راحت بھائی سب کچھ تھے تھانیدار انہیں جھک جھک کر سلام کیا کرتے اور سپاہیوں کا تو یہ عالم تھا کہ راحت بھائی کو دیکھ کر اپنی لال پگڑی ہاتھوں پر لے لیتے مگر امسال نہ اس بستی کے کپتان صاحب آتے نہ آئی جی صاحب اور راحت بھائی بیچارے مارے ڈر کے کسی سپاہی کے قریب نہ پھٹکتے تھے بندوق اور پستول کی دہشت تو ان کے دل میں ایسی بیٹھ گئی تھی کہ وہ انہیں دیکھتے ہی دم بخود رہ جائے۔ آہ راحت بھائی۔

اور مختار نانا کی جمنا پاری بکریاں اُن کا سرمایۂ حیات ہیں وہ صبح ایک بڑا سا لگا لے کر بکریوں کے ساتھ جنگل کی طرف نکل جاتے ہیں اور دن بھر انہیں پتے جھوڑ جھوڑ کر کھلاتے ہیں اب ایک ذاری سی کیفیت ان میں پیدا ہو گئی ہے۔ محرم اگر نہ آئے تو وہ بھی بستی میں نہ آئیں۔ بکریوں کا دودھ پی کر اب تک زندہ رہے ورنہ مار ڈالنے میں زمانے کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ اسکول کے بچوں کے ساتھ کبھی کبھی گا اُٹھتے ہیں وہ بھی بکری کے دودھ کی تاثیر ہوگی ورنہ اور ان کی کوئی غرض نہیں مختار نانا بیچارے بکری کا دودھ پیتے تھے زندہ رہنے کے لئے اور باپو کی امر کہانی گا رہے گے لئے۔

اس بستی کا جمن پہلوان ابھی زندہ ہے، ہجرت کرنے کے قابل نہ تھا۔ اس لئے اب بھی اپنے کسرتی بدن کے ساتھ اسی کچے مکان میں رہتا ہے پیشہ اسکا کبھی بھی کچھ نہ تھا جوانی میں کسرت کرتا تھا کشتی لڑا کرتا تھا مگر جب جوانی سے عمر تجاوز کرنے لگی تو پتہ چلا کہ پہلوانی کا شوق محض شوق کی بدولت نہیں چل سکتا اور اس فکر کے لاحق ہوتے ہی بدن گھٹنے لگا "مسجد میں چراغ جلانے والی فکر"

سے جھمن روز بروز دُبلے ہوتے گئے بدن تو کسرتی رہا مگر سارا کس بل نکل گیا۔ اور اب وہ بستی میں اپنا بڑا سا ڈھول لے کر ڈھنڈورا پیٹا کرتا ادھر کوئی نئی بات ہوئی تو جھمن نے ڈھول لے کر پیٹ دیا جھمن کو کسی گھر سے کھانا مل جاتا تھا کسی گھر سے کپڑا زمیندار ان نے کچھ زمین بھی اسے دے رکھی تھی۔ جس پر وہ تھوڑی بہت کاشت کر لیا کرتا تھا مگر ادھر جب سے زمین کاشتکار کی ہو گئی سرکاری طور پر وہ ایک طرح سے اُس زمین کا ملک بنا دیا گیا تھا تو جھمن کی نگاہیں اپنے پرانے مالکوں کی طرف سے پھر گئیں ڈھنڈورا وہ اب بھی پیٹتا ہے مگر اب اس کی ڈھولک کی آواز سے لوگ ڈرنے لگے ہیں۔ حکم کانگرس سرکار کا ..... اس کے بعد کوئی نہ کوئی سرکاری اعلان ہوتا۔ کسی کا باغ نیلام ہونے لگا تو جھمن نے ڈھول پیٹا۔ کسی کے گھر پر قرقی آگئی تو جھمن نے چلا چلا کر اس کا اعلان کیا اب بستی کے تمام شریف آدمیوں کی عزت آبرو جھمن کے ہاتھ تھی۔ مختار نانا بیچارے جھمن کو دیکھکر ہمیشہ اپنی بکریوں کی طرف نگاہ بھر کے دیکھ لیا کرتے تھے۔ اکثر وہ وقت پر مالگذاری کا روپیہ نہ جمع کر پاتے تھے اور انہیں اب یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں جھمن ان بکریوں کو نیلام نہ کر دے تھپا خالہ تو اپنے گھر کے دروازے ہر وقت بند ہی رکھتی تھیں۔ ان کے گھر میں زعفرانی بیر کے بہت سے درخت تھے انہیں درختوں پر ان کی گذر اوقات تھی۔ جب کبھی بستی میں صدر اعلیٰ اور جج صاحب کی بیگم آتی تھیں تو یہ دروازے بڑی شان سے کھلا کرتے تھے پھر تھپا خالہ ان دونوں کو بڑے سلیقہ سے ایک ٹوکری میں زعفرانی بیروں کی ڈالیاں بھیجتی تھیں اور محرم کے دنوں میں ان بیروں کی اہمیت تبرک سے کم نہ تھی صدر اعلیٰ اور جج صاحب کی بیگم ایک دن خاص طور پر آ کر تھپا خالہ کی مہمان ہوئیں پھر تھپا خالہ کھانے میں ایسا

اہتمام کرتیں جیسے ان کے گھر میں کسی مرحوم کی فاتحہ ہو۔ یہ دونوں بیگمیں چھپا خالہ سے فرمائش کرتیں۔ آج اپنے ہاتھ سے پکا کر کریلے کھلاؤ خالہ۔ اور خالہ اس فرمائش پر کھل جاتیں پھر وہ بڑی شان سے ایک صاف پتیلی میں کڑوا تیل اور کریلوں کو انیٹھ اکر کفگیر سے چلانے لگتیں۔ پھر دنیا زمانے کی باتیں چل نکلتیں جج صاحب کے بنگلے کی باتیں صدر اعلیٰ کی کوٹھی کا ذکر۔ موٹر کیسے چلتا ہے؟ بجلی کیسے جلتی ہے۔ جج صاحب کا اجلاس؟ غرض اس قسم کی صدہا باتیں چھپا خالہ پوچھ ڈالتیں اور یہ دونوں بڑی خندہ پیشانی سے بتلاتی رہتیں۔ ایکمرتبہ تو چھپا خالہ نے غضب ہی کر دیا جج صاحب کی بیگم سے کہنے لگیں وہ جو تمہارے بوت پولیس کے سب سے بڑے افسر ہیں اگر چاہیں تو میرے کلو کو تھانیدار کرادیں اس کا بساط خانہ اب بالکل نہیں چلتا۔ بڑا پریشان ہے میرا کلو۔ جج صاحب کی بیگم بولیں تم خالہ اس کا کان پکڑ کر خود کہو۔ اگر اس کے اختیار میں ہے تو وہ ضرور کر دے گا۔ کلو تھانیدار تو خیر کیا ہوتے مگر جب چھپا خالہ نے آئی۔جی سے دعائیں دے کر کلو کے لئے کہا تو انھوں نے کانسٹبلی میں فوراً لے لیا چھپا خالہ کیلئے یہی تھانیداری تھی۔ وہ تو بستی کے بٹی چوکیدار کو بھی تھانیدار ہی سمجھتی تھیں جو کوئی پگڑی باندھ کر ان کے سامنے آجائے وہ تھانیدار ہے۔ مگر اب تو نہ جج صاحب کی بیگم ہیں نہ صدر اعلیٰ کی بیگم آئی جی صاحب بھی مدت ہوئی چلے گئے کلو بیچارہ رہ گیا ہے جب کبھی رخصت پر گھر آتا ہے تو ماں کے قدموں کو تو چوم کر رونے لگتا ہے اپنی بستی کے آئی جی صاحب کو یاد کر کے کہتا ہے کہ اس نوکری سے تو وہ بساط خانہ اچھا تھا۔ بڑی سختی ہے مجھ پر اب میں یہ ملازمت چھوڑ دوں گا۔ چھپا خالہ کہتیں اپنے افسر کے لئے زعفرانی بیر کیوں نہیں لیجاتا، ایسے بیر دنیا میں کہیں اور نہیں ہیں اور پھر

لینے دینے سے تو پھر بھی خوش رہتے ہیں آہ تھپا خالہ وہ یہ نہیں جانتیں کہ ان ہیروں کی قدر اس بستی کے باہر کچھ نہیں ہے کسی کی کوئی قدر اس بستی کے باہر نہیں ہے ٹھپا خالہ راحت بھائی اور مختار نانا اس بستی کے باہر اپنا کوئی مقام نہیں رکھتے۔ بستی کی یہ دیواریں جب سے گریں تب سے ان بیچاروں کو پتہ چلا کہ دنیا بڑی وسیع ہے افسری، زبیدہ اور ثریا ان تینوں کی شادیاں ہو گئیں اور ان کے یہاں اولادیں بھی پیدا ہو گئیں مگر انور اور جمال نے جو جگہیں ان کے دلوں میں پیدا کرلی تھیں وہ انہیں کا حصہ رہیں یہ تینوں جب کبھی اکٹھا بیٹھتیں انور اور جمال کا ذکر ان کی گفتگو میں ضرور آتا یہ تینوں دونوں کو برابر چاہتی تھیں افسری کو بھی دونوں پسند تھے۔ زبیدہ کو بھی دونوں اور ثریا کو بھی دونوں ہر ایک کے پاس دونوں کی تصویریں تھیں انور بھائی جمال بھائی، جمال بھائی انور بھائی یہی کہتے کہتے دلوں کے منھ سوکھتے تھے۔ مگر نہ اب انور بھائی تھے اور نہ جمال بھائی۔ راحت بھائی تھے مختار نانا کی بکریاں تھیں اور پھر مدرسے کے وہ بچے جو ترنگا جھنڈا لئے گایا کرتے تھے سنو سنو اے دنیا والو ـــــ

جمن پہلوان نے ایک مرتبہ اپنا بڑا سا ڈھول پیٹ کر اعلان کیا ـــــ حکم سرکار بہادر کا۔ کل دس بجے دن میں مختار حسین زمیندار کی بکریوں کا نیلام ہوگا اور روپیہ مالگزاری کے عوض سرکاری خزانہ میں جمع کر دیا جائے گا۔ اس نے ڈھول پیٹ کر دوبارہ اعلان کیا حکم سرکار بہادر کا کل دس بجے دن میں ـــــ راحت بھائی تو پیترا بدل کر رہ گئے اسلئے کہ اور کچھ ان کے اختیار میں نہ تھا تھپا خالہ اپنے گھر میں ڈھول کی آواز سنکر دہل گئیں بیچاری اپنے دل میں کہنے لگیں آج اگر جج

باصدرِ اعلیٰ کی بیگم ہوتیں تو مختار کے گھر کیوں قرقی آتی افسری، زبیدہ اور ثریا نے کہا خاندان کی عزت خاک میں مل رہی ہے، ان تینوں نے انور اور جمال کی تصویروں کی طرف گھور کر دیکھا۔ مگر وہ خاموش تھیں مختار نانا بیچارے اسکول کے بچوں کے ساتھ گا رہے تھے "سنو سنو اے دنیا والو"۔۔۔ کہ پھر جھمن کی گرجدار آواز سنائی دی۔ حکم سرکار بہادر کا ۔۔۔ اور دوسرے دن دس بجے کے قریب تانگے پر قرق امین آگیا۔ سب سے پہلے اسکی نگاہ رجب فقیر کے گھر پر پڑی جس کے بوسیدہ چھپر پر کدو اور لوکی کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اسے اس مکان کو دیکھ کر وحشت ہوئی اب وہ تاج محل کی دیدہ زیبی کہاں سے آتی۔ تاج محل ہجرت کر گیا تھا۔ پھر جب تانگا مکان کے سامنے سے گلیارے میں چلنے لگا تو رجب فقیر کے بچوں نے تانگے کے ساتھ ساتھ دوڑنا شروع کیا۔ مالک کی خیر سرکار کا اقبال بلند ہو کوئی پیسہ کوئی امام ضامن مگر قرق امین نے منہ پھیر کر جواب دیا۔ "ہم یہاں دینے نہیں لینے آئے ہیں۔" تانگہ گلیارے سے ہوتا ہوا بستی کے اندر داخل ہوگیا اور یہ بچے بڑی نا امیدی کے ساتھ لوٹ آئے۔

یاد رکھئے

انتظار حسین کی نئی تصنیف

ناول

پتھر

(دسمبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوگی)

گدھے

یہ افسانہ انگریز کے دورِ حکومت میں آزادی سے قبل لکھا گیا تھا

سڑک کی چڑھائی پر بدھو نے اسباب سے بھرے ہوئے ٹھیلے کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ کھینچنا شروع کیا۔ وہ ہمک ہمک کر جھٹکوں کے ساتھ اپنے قدموں کو اٹھا رہا تھا۔ آنکھیں اُبل آئی تھیں، چہرے اور گردن کی رگیں پھول کر سرخ ہو گئی تھیں، مگر ٹھیلے کے پہیے بجائے آگے لڑھکنے کے پیچھے کھسک رہے تھے، وزن کی زیادتی اور اس کی تنہائی نے اس پر اتنی سی پر زمین بہت سخت کر دی تھی۔ اس نے تھوڑا سا دم لے کر ایک اور بھرپور کوشش کی مگر پہیوں کو جنبش نہ ہوئی۔

دھت تیری ماں ——— معلوم نہیں کس کی ماں کو اس نے گالی دی اور پیروں کو زمین پر جما کر اُبھری اُبھری سانسیں لینے لگا۔ سانس اس کے آدھے پیٹ سے واپس آجاتی تھی اور چہرے کا رنگ سرخی سے سیاہی میں بدل گیا تھا۔

بڑی محنت کرنا پڑی تم کو، پیچھے سے سامان کے مالک نے ٹھیلے کے قریب آکر کہا۔ سامان بہت ہے اسی لئے میں نے کہا تھا کہ دو ٹھیلے لے کر آنا۔ مگر تم نے ڈبل مزدوری کی لالچ میں ایسا نہیں کیا۔

چڑھائی ہے بابو صاحب! ذرا سا دم لے لوں تو چلتا ہوں، بدکو کہنے لگا پیچھے سے کوئی زور لگا دیتا تو میری یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ ہاں بہت ہی سخت چڑھائی ہے، تم اکیلے ہرگز نہ کھینچ پاؤ گے مگر یہ سب کچھ تو تمہیں پہلے ہی سوچ لینا تھا، یہاں پیچھے سے زور لگانے کون آئے گا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں سامان ہے ورنہ تمہاری کچھ مدد کرتا۔

بدکو بابو کی تسلی بخش باتوں پر ہنسنے لگا۔ اُسے جو قوت درکار تھی وہ ان دفتر کے بابوؤں میں تھی کہاں؟ یہ کوئی سیاسی یا کاغذی ٹھیلا نہ تھا جو قلم کی قوت سے سرک جاتا۔ اس کے لئے تو جسمانی قوت درکار تھی۔ بابو کی انسانیت اور نرم گفتگو سے بدلو میں پھر نیا دم آ گیا اور اس نے اپنے کو ایک اور زور آزمائی کے لئے آمادہ کیا۔

ابھی نہیں۔ بابو نے اسے آمادہ دیکھ کر روک دیا۔ تھوڑا سا دم لے لو تمہاری سانس کی رفتار تک تو ٹھیک نہیں ہے، پانی پیو گے؟

جی نہیں، یہ سگرٹ بجائے پھینکنے کے مجھے دے دیجئے گا۔ اس کے دو کش لگانے کے بعد چل دوں گا۔

بابو نے آدھی جلی ہوئی سگرٹ اسی کے ہاتھ میں دیدی بدکو نے پہلا کش لگا کر سارا دھواں حلق کے نیچے اتارا اور پھر دو موٹی اور سیاہ لکیریں ناک کے

نتھنوں سے باہر نکال دیں۔ جب تک سگرٹ ختم نہیں ہوئی وہ دھوئیں نگلتا اور پیتا رہا۔ اب اس میں حقیقتاً تھوڑا سا دم آگیا تھا۔ چہرے پر سے تھکاوٹ کے آثار بھی کم ہو گئے تھے۔

بابو نے اطمینان دلاتے ہوئے پھر کہا :-

"جلدی نہیں ہے خوب اچھی طرح سے ستا لو"

سڑک پر اور بہت سے لوگ آ جا رہے تھے۔ بدھو کے دل میں کئی مرتبہ یہ خیال آیا کہ وہ کسی اجنبی کو ٹوک کر کہے "بھیا ذرا پیچھے سے ہاتھ لگا دو ... ..."

اور پھر پہیئے کی ایک جنبش اس کی قوت میں طوفان بپا کر دیتی مگر کسی سے اتنا کہنے کی وہ ہمت نہ کر سکا، آخر کار وہ خود ہی ٹھیلے کے ڈنڈوں میں بندھی ہوئی موٹی رسّی پر پیٹ کے بل اوندھ گیا۔

آنے والی سواریوں کے لئے یہ چڑھائی ڈھال کی صورت میں بہت فرحت بخش تھی، بلا کسی قوت کے سواریاں خود بخود لڑھکتی ہوئی چڑھائی پر سے اتر رہی تھیں۔ بغیر کسی امدادی قوت کے یہ لوگ لڑھکتے ہوئے چلے آ رہے تھے، زندگی بظاہر ایک سڑک ہی تو ہے غریبوں کے لئے چڑھائی اور سرمایہ داروں کے لئے ڈھال ٹھیلے کے پہیئے باوجود اس کی انتھک کوشش کے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی تمام قوت کو پوری طرح صرف کر رہا تھا آنکھیں پھر پہلے کی طرح اُبلی آتی تھیں۔ رگیں پھر اسی طرح پھول کر سُرخ ہو گئی تھیں مگر ٹھیلے کے پہیوں میں کسی قسم کا کوئی تغیر نہ تھا۔ وہ سڑک کے پتھروں

کی طرح اپنی جگہ پر جامد اور بے حس تھے۔

کچھ گٹھوں سے لدے ہوئے گدھے اپنے پیروں کو جھٹکاتے ہوئے اسکے پاس سے گذرے۔ ایک گدھا اپنی جھکی ہوئی پیٹھ کے ساتھ گذر گیا۔ پھر دوسرا پھر تیسرا۔ یہاں تک کہ پورے پچاس گدھے مَتر مَتر کرتے ہوئے اوپر چڑھ گئے اور وہ گدھا ـــــ اپنے ٹھیلے کے پہیوں کی ایک جنبش کا محتاج، اپنے مقام سے ایک انچ بھی ادھر سے اُدھر نہ ہو سکا۔ وہ گدھا بھی نہیں ہے زندگی میں پہلی دفعہ شاید اُسے یہ احساس ہوا۔ زندگی میں بسا اوقات انسان اپنے اور گدھے کے درمیان موازنہ کرنے پر مجبور رہے۔ مگر وہ تو ان گدھوں سے بھی زیادہ مجبور و بے بس تھا۔

بابو بدلو کی اس جفاکشی سے متاثر تھا، مگر بعد میں اُسے ہنسی آنے لگی بدلو ٹھیلے کی اس موٹی رسی پر نٹوں کی طرح سے اُچک کود رہا تھا۔ اس کی ایڑی چوٹی کا زور اب مضحکہ خیز ہو کر بابو کو ہنسانے لگا۔ ہر گذرتے ہوئے گدھے کے ساتھ وہ ہُمک کر رسی پر لٹک جاتا، وہ اس وقت حقیقتاً گدھوں سے مقابلہ کر رہا تھا۔ کچھ غصہ۔ کچھ جھلاہٹ، ہر گدھا اسے شکست دیتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ پچاس گدھے، پچاس کوششیں، پچاس شکستیں، اور پھر وہی مایوسی اور نا اُمیدی، اُس نے آخر کار پھر وہی گالی بکی ـــــ

دُھت تیری ماں ـــــ اور پیروں کو زمین پر جما کر اُبھری سانسیں لینے لگا۔

بابو نے پاس آکر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بس بس کلیجہ پھٹ جائے گا

منہ سے خون ڈال دو گے۔

مگر بابو جی ——— نہ معلوم وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ آواز اس کے خشک گلے سے باہر نہ نکل سکی، وہ اونچائی پر پہنچے ہوئے گدھوں کی طرف ہاتھ بڑھا کر کھانسنے لگا۔ دم گھوٹنے والی کھانسی اُسے آتی رہی۔

بابو کہنے لگا۔ بھائی یہ ہندوستان ہے، یہاں کے انسان گدھوں سے کم وقعت رکھتے ہیں، ہم تم بھی انسان ہیں اور لعنت ہے ہم پر، بابو کو اس کچلی ہوئی انسانیت پر ترس آنے لگا۔ آخر وہ بھی تو ایک انسان ہی تھا۔ ایک انسان جہاں تک دوسرے انسان کا کچلنا دیکھ سکتا تھا، اس نے بھی دیکھا اور جب بدلو کی حرکتیں مضحکہ خیز ہو گئیں تو ایک دم گھوٹنے والی اذیت ہنسی بنکر اس کے ہونٹوں سے کھیلنے لگی۔

کس قدر مظلوم ہے انسان، اور قابلِ رحم۔ وہ گدھا تک نہیں ہے؟

فوج میں بھرتی کرنے والا سپاہی کچھ نئے رنگروٹوں کو لئے ہوئے اس کے پاس سے گذرا، بدلو شاید پہلے سے اسے جانتا تھا۔ اُس نے آواز دی۔

گھنشیام؟

اور گھنشیام نے بدلو کے افسردہ چہرے کو دیکھ کر پہلے ہی سے کہنا شروع کر دیا، چار ٹھیلوں کا سامان لادے ہوئے ہو، بڑم راکس کہیں کے۔

گھنشیام کے اتنے اشارے پر تمام رنگروٹ ٹھیلے کے بہتوں میں اِدھر اُدھر لگ گئے۔ بہیوں میں جنبش ہوئی اور ٹھیلہ چڑھائی پر چڑھنا شروع ہوا

بدکو اور گھنشیام آپس میں باتیں کرنے لگے -

لڑائی میں کیوں نہیں بھرتی ہو جاتے؟ اس زندگی سے وہ خطرہ بہت اچھا ہے، اٹھارہ روپے طلب ملے گی، کھانا کپڑا، دودھ علاج سب مفت،

تم جب دیکھو مجھ سے یہی کہا کرتے ہو، دینا پڑی ہے مجھے معاف رکھو، میں اپنی اس زندگی سے خوش ہوں، سارے دن کی محنت مشقت کے بعد اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا تو ہوں -

اوندھی کھوپڑی کے ہو نہ؟ بیوی بچے سب پیسہ کے دوست ہیں - تمہارے اِن موٹے موٹے ہاتھ پیروں سے کوئی محبت نہیں کر سکتا - کیا کرو گے اس زمانہ میں؟ اناج کی گرانی دیکھو جیسے غلہ ہندوستان میں پیدا ہی نہیں ہوتا کپڑا نہ ملے گا تو عزت کاہے سے ڈھانپو گے؟

ہو گا، چھوڑو ان باتوں کو، کچھ لڑائی کا حال بتاؤ، کہاں ہو رہی ہے کون جیت رہا ہے -

اِن باتوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں گھنشیام کہنے لگا - ہمارا کام ہے آدمی کی تجارت - تم کس برتے پر بولتے ہو؟ اس وقت انسان بڑا سستا ہے صرف سات روپے اس کی قیمت ہے - ایک بکری کے بچہ سے بھی کم بسکہ ۱۹۴۲ء سے اب تک چھ ہزار آدمیوں کو سرکار کے ہاتھ بیچ چکا ہوں - آج یہ سولہ رنگروٹ میرے ہی ہاتھوں کے بیچے ہوئے آسام جا رہے ہیں -

سولہ نو عمر چہروں کی طرف بدکو نے بہت غور سے دیکھا - جو دونوں بہیوں سے چمٹے ہوئے ٹھیلے کو آگے بڑھا رہے تھے - تمام نوجوانوں کی

آنکھیں بھی ایک ساتھ اُٹھ کر بدکو کے چہرے کو نہ معلوم کیوں تکنے لگیں۔

بدکو نے پوچھا۔ تم سب ایک ہی جگہ سے آئے ہو۔ یا یہاں آکر مل گئے؟

ایک لڑکا جو بدکو کے قریب تھا بولا۔ ہم سب کا ایک ہی گاؤں ہے اور سب ایک ساتھ اس لیئے بھرتی ہوتے ہیں کہ گھر چھوٹنے کا زیادہ غم نہ ہو

ماں باپ زندہ ہیں تم لوگوں کے؟ یہ سوال بدکو نے کچھ عجیب انداز میں کیا۔ مطلب یہ تھا کہ والدین کی موجودگی میں جنگ پر جانا کیسا؟

جی ہاں ہم لوگوں کا کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ اگر ماں نہیں ہے تو باپ ہے اور باپ نہیں ہے تو ماں ہے۔

بدکو کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر گھنشیام نے روک دیا۔ بس اب کچھ اور نہ کہنا زبان بند کرنے کا زمانہ ہے۔

دوسرا لڑکا بلا کچھ سمجھے بوجھے بول پڑا۔ ماں باپ تو سب ہیں مگر پولیس کے ظلم اور نمبردار کے ڈنڈوں نے ہمیں اپنے گاؤں سے نکالا۔

علاقہ میں کہیں ڈکیتی پڑے ہم سب کے نام اسمیں موجود پولیس کو رشوت دیتے دیتے گھر گرہستی سب پر زوال آگیا۔

آپس کی پھوٹ اور مقدمہ بازی میں تباہ ہو گئے۔ زمینداروں نے چار چار مرتبہ لگان کا روپیہ وصول کیا، جب ہر طرح سے لٹ گئے تو لڑائی میں آکر بھرتی ہوئے ورنہ نہیں تو کیا کوئی اپنا گھر بار خوشی سے چھوڑتا ہے۔؟

اسباب سے لدا ہوا ٹھیلا بہت آسانی سے چڑھائی پر چڑھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ چڑھائی ختم ہو کر جب پھر سڑک ایک سطح پر آگئی تو بدکو بولا۔

بس اب تم لوگ الگ ہو جاؤ۔ بڑی تکلیف ہوئی تم کو خدا کرے سب کی ترقی ہو اور پھر ساتھ خیریت کے اپنے گھر کو واپس آجاؤ۔

سب لڑکوں کے چہروں پر مسکراہٹ کھیل گئی، گھنشیام کی ایک آواز پہ سب ایک لائن میں فالن ہو گئے اور پھر سڑک کے ایک کنارے پر قدم ملا کر چلنے لگے۔

(POOR INDIA) ایک نو وارد امریکن نے اپنے گائڈ کا شانہ دبا کر کہا اور کیمرہ سنبھالتا ہوا تانگہ سے اتر پڑا۔

بہت غریب ملک ہے حضور! گائڈ نے امریکن کو اور زیادہ متاثر کرنے کی کوشش کی۔ یہ ٹھیلہ والا دن بھر کی محنت کے بعد دس بارہ آنے پیسے کمائے گا۔ یہ ہندوستان ہے حضور ہے ہر ازلی مصیبت کا یادگار اور اتنا کہنے کے بعد گائڈ نے بدلو کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔

بہت جاکش ملک ہے۔ امریکن کہنے لگا، مگر یہاں کی حکومت نے اسے کس طرح روا رکھا؟ ہمارے ملک میں ہر وہ کام جرم ہے جو دوسروں کے اس احساس پر بار ڈالے، وہاں کے جانور بھی ظلم و تشدد کے عادی نہیں ہیں۔

اور یہاں حضور زندگی جرم ہے اور انسانیت ایک بہت بڑا گناہ

امریکن نے گائڈ کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے کیمرہ سے بدلو کی تصویر کھینچی، جب تصویر کھنچ گئی تو اس نے بدلو کے ہاتھ پر ایک دس روپے کا نوٹ رکھ کر کہا۔ یہ تمہارے اتنی دیر ٹھہرنے کی مزدوری ہے۔

امریکن اور گائڈ پھر تانگہ پر بیٹھ کر روانہ ہو گئے - نوٹ کی گرمی بدھو کے تمام جسم میں سرائیت کر گئی اب وہ اور زیادہ گرمجوشی کے ساتھ ٹھیلے کو کھینچنے لگا - وہ اپنے دل میں سوچنے لگا - یہ بھی خدا کی دین ہے - بابو جواب تک بدھو کا نفسیاتی مطالعہ کر رہا تھا - بولا، محنت وصول گئی -

جی ہاں، مگر شاید اس نے شراب پی رکھی تھی، وہ ضرور نشہ میں تھا - پاگل آدمی وہ ہوش وہواس میں تھا - امریکہ دیس کا رہنے والا ایک صاحب تھا جو ہندوستان میں تمہیں دیکھنے آیا ہے - اگر تم آسانی سے اپنی تصویر نہ کھنچواتے تو اور زیادہ روپے ملتے - یہ اس ملک کا باشندہ ہے جہاں زندگی کی ہر سانس کی قیمت ہے -

بدھو کے چہرے پر اب انتہائی شگفتگی تھی - اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ بابو کی باتوں کا کیا جواب دے -

ہندوستان —— امریکہ —— زندگی کی ہر سانس کی قیمت اس کے لئے بے معنی سی چیزیں تھیں - اُسے دس روپے مل گئے تھے - ہندوستان غریب ہو یا امریکہ سرمایہ دار وقتی طور پر جو بابو کے احسانات بھر کے تھے ان کا بغیر کچھ احترام کئے ہوئے وہ خاموشی سے اپنا ٹھیلہ گھسیٹنے لگا - دل ہی دل میں امریکن نووارد کو دعائیں دیتا ہوا وہ اس ہموار سڑک پر پانی کی طرح سے بہہ رہا تھا -

اور آج کتنے دن ہوئے جب رحیم تانگہ والا مجھ سے کسی امریکن صاحب کی تعریف کر رہا تھا - بدھو نے کہنا شروع کیا - اس امریکن نے رحیم کو ایک گھنٹہ

کی مزدوری پچیس (۲۵) روپے دیتے تھے۔ وہ اب کسی ہندوستانی کو اپنے تانگہ میں نہیں بٹھاتا۔

بابو نے جواب دینا چاہا مگر یہ سوچکر کہ بدلو سیاست نہیں سمجھتا ہندوستان کی تاریخ نہیں جانتا۔ اس لئے خاموشی سے مسکرانے لگا۔

آپ کی تصویر نہیں کھینچی اس نے بابو جی؟

ہماری تصویر بہت دن ہوئے جب کھینچی گئی تھی اس کا حق الخدمت مجھے چالیس روپے ملتا ہے۔ ایسٹ انڈیا ریلوے کا ملازم ہوں۔ میری تصویر انگریزوں نے کھینچی تھی۔ تصویر کھینچنے والے ہمارے ملک میں بہت آئے۔ شیر شاہ سوری۔ محمد تغلق۔ ابراہیم لودھی۔ تیمور لنگ انگریز یہ سب تصویر ہی کھینچنے والے تو تھے۔

راستہ ان باتوں میں کٹتا چلا گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے بے خبر ہو کر گفتگو کر رہے تھے۔ بدلو چاہتا تھا کہ بابو اس امریکن کی تعریفوں میں اس کی ہاں میں ہاں ملائے جس نے دس روپے دے کر اس کی دنیا ہی بدل دی تھی بابو چاہتا تھا کہ بدلو ان دس روپوں کی حقیقت کو سمجھ لے۔

سامنے سے وہ گدھے گوں کو گرانے کے بعد پھر واپس لوٹ رہے تھے۔ پھولوں کی طرح ہلکے پھلکے۔ سڑک پر کلیلیں کرتے ہوئے جتنے آدمی گدھوں کے ساتھ تھے وہ بھی اُن کے پیچھے بھاگ رہے تھے ان بے قابو گدھوں سے کسی کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ تھا۔ دور ہی سے

ہر شخص کی سانس پھولی ہوئی تھی مگر گدھے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔

بدلو نے جب بابو کی باتوں کو خاموشی سے پی لیا تو اس کا دل چاہا کہ وہ ان گدھوں کو مخاطب کر کے بھی سب کچھ کہے۔ ہندوستان میں کوئی غیر ملکی ان گدھوں کی تصویریں نہیں اُتارتا ؟ اس نے قدرے جلبلاہٹ اور غصہ میں آ کر بدلو کو پھر مخاطب کیا۔

اِن گدھوں کو دیکھو انسان کا اِن پر کوئی قابو نہیں، مگر ہندوستان کے چالیس کروڑ انسان گدھے بھی نہیں ہیں ؟ جن پر مٹھی بھر انسانوں کا قبضہ ہے۔ بابو نے گھور کر بدلو کی طرف دیکھا اس اُمید پر کہ شاید وہ کچھ جواب دے مگر بدلو اپنے ہلکے قدموں کو اس ہموار سڑک پر خاموشی سے اٹھا اٹھا کر رکھ رہا تھا۔

سویا ہوا ہاتھ

خاندان کا یہ سب سے ضعیف اور پرانا ہاتھ جس کے نیچے کئی پودیں پروان چڑھ چکی تھیں مدت سے سویا پڑا تھا۔ اس کی اُبھری ہوئی رگیں اور موٹے پٹھے بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ اس پر کچھ شگاف نما نشانات تھے۔ بیچ ہتھیلی میں ایک گہرا غار تھا۔ اور دو انگلیوں کے ناخن سڑ کر گر چکے تھے۔ یہ بوڑھا انسانی ہاتھ کبھی سینہ پر، کبھی ران پر اور کبھی جسم سے الگ بے ترتیبی کے ساتھ پڑا رہتا۔ اس سوئے ہوئے ہاتھ میں جاگ اُٹھنے کی قوّت نہ تھی۔ مگر اکثر ایسا ہوتا کہ یہ مفلوج ہاتھ ایک تھرتھراہٹ کے ساتھ اُٹھتا اور گر پڑتا۔ جیسے وہ اب تک زندگی کی جدوجہد میں مصروف ہو۔ بوڑھا اکثر ایک خوفناک کراہ کے ساتھ اپنی مٹھی بند کرنے کی کوشش کرتا مگر بے سُود ... ...

ایسا معلوم ہوتا جیسے زندگی موت کے پیچھے دوڑ رہی ہے اور خود ٹھوکر کھا کر گر پڑی ہے۔ سویا ہوا ہاتھ اُٹھتا اور گر پڑتا۔ زندگی موت کے پیچھے دوڑ کر خود موت بن جاتی —— جدوجہد ——

نہ جانے کتنوں کو اس سوئے ہوئے ہاتھ نے ابدی نیند سُلایا۔ کالی کالی آندھیاں دیکھیں اور پھر بھی نہ جاگ سکا۔ گھر بھر میں بجز انورادھا کے اب اور کوئی نہ تھا۔ ایک سویا ہوا ہاتھ اور انورادھا مل جل کر زندگی کے ایک دشوار گذار راستہ پر چلے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں یہ زندہ لاش اور اس کی پژمردہ لڑکی انورادھا رہتی تھی۔

تحصیل کے سپاہی جب اس گاؤں میں آکر ٹھہرتے تو انورادھا سے اپنا کھانا پکواتے۔ اور اس طرح یہ دونوں باپ بیٹی اپنے پیٹوں کو ایک وقت پال لیتے۔ پھر جب وہ لوگ گاؤں سے چلنے لگتے تو انورادھا جب کی طرف ہنس کر دیکھ لیتی وہ اُسے کچھ پیسے بھی نذر کر دیتا۔

تہابیر دل کے ٹیلے پر گاؤں کا میلہ لگنے والا تھا اس لئے انورادھا نے جسارت کر کے ایک دن سپاہی سے زیادہ پیسے مانگے۔

وہ بولا۔ روپیہ لیگی؟

نہیں،

میرے ساتھ چلے گی؟

نہیں۔

اچھا چل تجھے میلے کے لئے چیزیں خرید دوں۔

نہیں۔

تو پھر کیا پیسے مفت کے ہیں جو دیدوں چل ہٹ یہاں سے۔

الورادھا شرما گئی۔ بڑھا ہوا ہاتھ گر گیا۔ کتنا فرق تھا، ان دونوں ہاتھوں میں خاندان کا سب سے ضعیف اور پرانا ہاتھ جس کے نیچے کئی پودیں پروان چڑھ چکی تھیں اور جو مدت سے سویا ہوا پڑا تھا۔ الورادھا کا گرا ہوا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش یہ بھی سو جاتا۔ اسے ابدی نیند آجاتی غیرت جب سو جاتی ہے تو ہاتھوں کی قوتیں بڑھتی ہیں۔ الورادھا کے سینہ پر جیسے کسی نے گھونسا مار دیا ہو، وہ گھر لوٹ آئی اور اپنے باپ کے مفلوج ہاتھ کو پکڑ کر رونے لگی۔

آج زندگی میں پہلی دفعہ ایک سپاہی نے اس کی ہتک کی تھی۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو ٹھکرایا تھا۔ اس نے سوچا دنیا کے وہ تمام ہاتھ جس میں جان ہے، حرکت ہے غیرت سے خالی ہوں گے۔

اور اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے باپ کے سوئے ہوئے ہاتھ پر بوسے لینا شروع کیے، عقیدت کے بوسے۔

بوڑھے نے الورادھا کے چہرے کو غور سے دیکھا پھر اسی مفلوج ہاتھ کے اشارے سے روٹی مانگی۔

الورادھا بولی، آجکل تو ویسے ہی کال کا زمانہ ہے دان اور پن کون کرے، رہی بھیک تو وہ مجھ سے مانگی نہیں جاتی۔

مگر مجھے تو بہت بھوک لگی ہے، رادھا کہیں سے لا کر کچھ کھانے کو دو اور بوڑھا بچوں کی طرح بلبلانے لگا۔

الورادھا نے باپ کی یہ بے چینی دیکھی تو یہ کہنے لگی۔

تمہیں تو اب ایشور اٹھا لیتے۔ بہت تو رہے اس جگ میں۔ ان کی بھی نرالی لیلا ہے۔ جہاں جیون کی ضرورت تھی وہاں جیون ہی جیون۔ ہاتھ پاؤں تھک چکے ہیں۔ آنکھوں سے دکھائی نہیں دیتا۔ ایک ہاتھ سو گیا ہے تم بھی سو جاتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

بوڑھا بولا۔

اور پھر تو کسی سپاہی سے شادی کر لیتی، اس کا بے حس و حرکت ہاتھ تھرتھرانے لگا۔

کون کرے گا شادی میرے ساتھ؟ تحصیل کے سپاہیوں کا بھوجن بناتی ہوں۔ ان کے تھالوں سے جو کچھ بچتا ہے وہ ہمارے اور تمہارے پیٹوں میں چلا جاتا ہے۔ اس گاؤں میں مجھے بہو بنا کر کون رکھے گا؟ ———

اور یہ بیاہی؟ تم اتنے بوڑھے ہو کر بچوں کی طرح باتیں کرتے ہو؟

میں اتنا بوڑھا ہوں کہ پھر بچہ بن گیا ہوں، بوڑھے اور بچے میں کوئی فرق نہیں دونوں کمزور اور بے بس ہوتے ہیں۔ میں بہت بھوکا ہوں مجھے روٹی دو۔

اب تم کے برس کے ہو گئے ہو؟ اور رادھا بوڑھے کو بچوں کی طرح بہلانے لگی

بوڑھا ہنسا۔ کہنے لگا۔ پچھلا غدر میرے سامنے ہی آیا تھا۔ بڑا برا وقت تھا رادھا۔ لوگ اپنے بچوں کو آگ پر بھون کر کھا جاتے تھے، بہتوں نے اپنی اولاد دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالی، اس وقت تمہاری ماں بھی زندہ تھی میرے پاس کئی کھیت تھے۔ ان میں بہت سا غلہ پیدا ہوتا تھا۔ اسی گاؤں میں میں نے بہتوں کو روٹی دی ہے یہ سپاہی جن کی تھال کا ہم آج بھوجن

کھارہے ہیں کبھی ہمارے مہمان تھے۔ یہ ریت اسی وقت سے چلی آ رہی ہے ہمارا ہی گھر ان کا اڈا تھا۔ وقت کی بات ہے جنہیں کبھی ہم نے کھلایا تھا۔ وہ آج ہمیں کھلا رہے ہیں مگر یہ سب بکواس ہے، مجھے کہیں سے لاکر روٹی دو۔

اور یہ بھی تو کلجگ ہے الو ادھا بولی۔ تم مجھے بھون کر کیوں نہیں کھا جاتے مجھے دوسروں کے ہاتھ کیوں نہیں بیچ ڈالتے؟ یہ ریت بھی اسی وقت سے چلی آ رہی ہے،

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ سوکھے ہاتھ میں پھر لرزش شروع ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ زبردستی کھینچ کر اپنی مٹھی بند کرلی گویا اس کی زندگی بھر بیکار رہے موت اسکے پیچھے یہ سمجھ کر بھاگ رہی ہے کہ اس دوڑ میں اسے ایکدن ضرور فتح ہوگی۔۔۔۔۔ مگر ہاتھ کی لرزش پھر بند ہوتی مٹھی کھلی اور موت پھر جیسے آزاد ہو کر زندگی کو منہ چڑھانے لگی۔

کرب و بےچینی کے اس آخری دور کے بعد بوڑھے پر ایک خاموشی چھا جاتی تھی اور الو ادھا اس کے پاس سے ہٹ جایا کرتی تھی۔ وہ اکثر بوڑھے کی اس تکلیف کا احساس بہت شدت کے ساتھ کرتی اور اس احساس کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی وہ یہ بھی سوچتی کہ دنیا میں غریبوں کو زندگی کیوں ملی۔ ایسی زندگی جس سے تندرستی، خوشی اور آرام چھین لیا گیا ہو۔ کیا غریب درخت، سڑک یا پل کی صورت میں نہیں پیدا کئے جا سکتے تھے۔ اس کے خیال میں غربت کی اہمیت اس دنیا میں ان بے جان چیزوں سے بھی کم تھی۔ اس نے اپنے تصور میں گھر کی ایک کچی دیوار کو غریب کا لقب دیکر اس پر ترس کھانا شروع کیا۔ آہ بیچاری کتنی غریب ہے۔ بے زبان معصوم۔ مدت سے اسی طرح بوسیدہ حالت

میں کھڑی ہے کبھی اس کی مرمت کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اسی سے ملی ہوئی پرتاب سنگھ کے مکان کی پختہ دیوار تھی۔ جس پر ہر سال سفیدی اور پلاسٹر ہوتا تھا۔ اس پختہ دیوار کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انوزادھا نے ایک بھرپور لات دیوار پر ماردی۔ کچی دیوار گرپڑی اور اس کی جگہ سفید پلاسٹر والی پختہ دیوار نے لے لی۔

——— تو اب تک گر کیوں نہ گئی بہت تو رہی اس جگ میں، مگر کتنا فرق تھا ان دونوں دیواروں میں، اگاؤں کی سب سے پرانی اور کمزور دیوار جس کے نیچے انوزادھا کھیل کر جوان ہوئی۔ ایک مٹی کے ڈھیر میں بدل گئی اور وہ سفید پلاسٹر والی پختہ دیوار، کاش کہ وہ بھی مٹی کا ایک ڈھیر ہوتی، وہ ٹوٹی ہوئی دیوار سے لپٹ کر رونے لگی۔

باہر سے کسی نے دروازہ کی کنجی بجائی اور بوڑھے نے اسے اندر بلا لیا۔

انوزادھا گری ہوئی دیوار کے پاس بیٹھی رو رہی تھی شاید وہ بھی بھوکی تھی، تین دن سے گھر کا چولھا نہ جلا تھا۔ اس نے ایک دفعہ گردن گھما کر آنے والے کو دیکھا۔ سپاہی بڈھے سے بیٹھا ہوا کچھ سرگوشیاں کر رہا تھا۔

میں کسی تحصیل کا سپاہی نہیں ہوں راجہ صاحب کا خاص اردلی ہوں میرا کہنا مانو۔ اس سے اچھا موقع اور کیا ملے گا؟ انوزادھا کون کون کھانے پکا لیتی ہے؟

دال - بھات، بھاجی۔

اور؟

اچار، دلیہ،

اور؟

اور پوری - پراٹھے، کچوری۔

اور؟

اس اور، کا مطلب بوڑھا نہیں سمجھا۔ کہنے لگا بس اور کچھ نہیں، مگر تمہارے راجہ صاحب تو اچھے اچھے کھانے کھاتے ہوں گے؟

ہاں، اچھا برا ہر قسم کا کھانا وہ کھاتے ہیں۔

تمہارے پاس اس وقت کچھ کھانے کو ہے۔ بوڑھے نے بلبلا کر پوچھا، مجھ پر تین پہر گذر چکے ہیں، منہ میں دانہ نہیں گیا۔

اردلی بولا۔ انوزادھا کو میرے ساتھ کر دو تھوڑی دیر میں اچھے اچھے کھانے لے کر آجائے گی۔

تو پھر جاؤ انوزادھا کو ساتھ لے کر جلدی جاؤ۔ میں بہت بھوکا ہوں۔

اردلی، انوزادھا کے پاس آکر ہنسنے لگا۔ اس مٹی کے ڈھیر میں کیا رکھا ہے چلو میرے ساتھ راجہ صاحب نے یاد کیا ہے۔

انوزادھا راجہ صاحب کا نام سنکر چونک پڑی۔ راجہ صاحب کا کیمپ اس مرتبہ انوزادھا کے گاؤں میں لگا ہوا تھا۔ سال میں وہ اسی موقع پر تحصیل وصول کے لئے نکلتے تھے۔ صبح سے لوگ انڈے، مرغی

اور دوسری چیزوں کی تلاش میں دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ آج راجہ صاحب نے اس اردلی سے کہا تھا ـــــ دو مرغیاں اور دس انڈے لیکر آنا اور ہاں اس کے ساتھ کچھ اور بھی، سمجھ گیا؟

اس کچھ اور، کو تلاش کرتے کرتے اردلی الوزادھا کے گھر پہنچا۔ انڈے، مرغی کے ساتھ کچھ اور کی جستجو میں الوزادھا نے خوش ہو کر کہا۔ تمہارے راجہ صاحب میرے ہاتھ کا کھانا پسند کریں گے؟ میں انڈا مُرغی پکانا نہیں جانتی۔

وہ دال بھات بھاجی بھی کھا لیتے ہیں بشرطیکہ مزیدار ہو۔ نمک اور مرچ اچھا ہو۔

بھوک میں انسان مدتا زیادہ ہے مگر اس وقت الوزادھا ہنس رہی تھی۔ کتنے اچھے ہیں راجہ صاحب جو دال بھات اور بھاجی بھی کھا لیتے ہیں۔

ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ ـــــ

آدھی رات گذر گئی۔ گاؤں میں پہرے دار کی آواز گونجنے لگی مگر الوزادھا راجہ صاحب کے کیمپ میں تھی۔ بڈھے کو اب بھوک نہیں ستا رہی تھی وہ الوزادھا کے لئے بے چین تھا۔ اس نے سوچا آج وہ کتنے قسم کے کھانے پکا رہی ہے، چوپال کے گھنٹہ نے بھر دو کا گجر بجایا بڈھے سے نہ رہا گیا وہ اپنی چارپائی سے اُٹھ بیٹھا۔ سوئے ہوئے ہاتھ میں بہت زیادہ لرزش تھی۔ غیرت نے سہارا دے کر اسے چارپائی سے

اٹھاکر کھڑا کردیا۔ سوئی ہوئی غیرت جاگ اُٹھی تھی۔ مفلوج اور مُردہ ہاتھ میں کچھ جان اور حرکت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر نکل کھڑا ہوا۔ اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم راجہ صاحب کے کیمپ کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اس نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے اس کے اپنے کھیت تھے۔ ان میں غلہ پیدا ہوتا تھا۔ گھر میں مہمان تھے۔ اس کے قدم شدت کے ساتھ ڈگمگا رہے تھے۔ زندگی موت کے پیچھے دوڑ رہی تھی۔ سویا ہوا ہاتھ بار بار اُٹھتا تھا۔ اور گر جاتا تھا۔ زندگی موت کے پیچھے دوڑ کر خود موت بنی جا رہی تھی۔ جدوجہد ... ... انسان کا ہاتھ .... موت اور زندگی ... ...

ایک ٹھوکر کھاکر بوڑھا گر پڑا۔ موت نے زندگی کو دبوچ لیا۔ زندگی صدیوں سے موت کے پیچھے دوڑ رہی تھی اور آخرکار ٹھوکر کھاکر گر پڑی۔

صبح کو ایک پنچایت نامہ مرتب ہوا۔ لاش کی شناخت ان الفاظ میں کی گئی ... ...مفلوج ہاتھ پر کچھ شگاف نما نشانات ہیں۔ بیچ ہتھیلی میں ایک گہرا غار ہے اور دو انگلیوں کے ناخن سڑ گل کر گر چکے ہیں۔ اسکے بعد یہ سویا ہوا ہاتھ پھر مردہ لاش کے سینہ پر رکھدیا گیا۔

اکثر شبِ تنہائی میں

اب بھی وہ پچھلی باتیں شدت کے ساتھ یاد آجاتی ہیں لیکن کبھی کبھی نہ اُن پچھلے واقعات میں وہ تازگی رہی نہ مجھ میں سکت، دن گذرتے جائیں تو ہر غم خود بخود اعتدال پر آجاتا ہے۔ جس وقت یہ مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ کر مجھ پر گرا تو عزیزوں کو بھی چوٹ لگی، پھر مجھ پر جتنا بھی اثر نہ ہوا ہو کم ہے۔ سلیمان جس روز سے کمیشن لینے کے بعد جنگ پر گئے اُسی دن سے میری تمام خوشیوں نے حسرتیں بنکر رونا شروع کیا۔ وہی خوشیاں آج بھی کبھی کبھی روتی ہیں۔

اباّمیاں کی تمام تر توجہ میری ہی تعلیم کی طرف تھی۔ بھائی جان کُند ذہن تھے۔ طاہرہ باجی پڑھنے لکھنے کی طرف فطرتاً بدذوق تھیں میری چھوٹی بہن عقیلہ ابتدائی درجوں میں تھی اور کچھ کہا نہ جا سکتا تھا کہ وہ ہم دونوں بہنوں میں کس پر پڑے گی۔ یہ اسوقت کا ذکر ہے جب دوسری جنگِ عظیم شروع ہو کر اپنی ہلاکت خیزیاں سارے عالم پر پھیلا چکی تھی۔ سلیمان میرے

ساتھ بی، اے میں تھے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کا بی، اے کلاس اُس زمانے میں اتنا معیاری درجہ تصوّر ہوتا تھا کہ بعض طالب علم ارسطو اور لقمان بن کر نکلتے۔ سلیمان بھی اُن میں سے ایک تھے، بلا کے ذہین۔ انتہائی شوخ اور بذلہ سنج میں اُن سے مانوس تھی، اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتے تھے، پھر جب آپس کی ملاقاتیں دوسروں کی نظر میں مشکوک بننے لگیں تو میری اُن کی منگنی ہوگئی۔ ابا میاں کو میرے مستقبل سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ تو صرف مجھے تعلیم دلانے کی دُھن میں مگن تھے۔ انھوں نے سلیمان سے ملنے پر کوئی پابندی لگائی، نہ کبھی گھر سے غیر حاضر ہونے پر ٹوکا۔ پھر جب میں نے سلیمان کے ساتھ شادی کرنے پر طاہرہ باجی سے اپنی رضامندی کا اظہار کیا تو ابا میاں نے خود ہی اپنے ہاتھوں سے منگنی کی رسم ادا کردی۔ اُس زمانے میں سلیمان یونیورسٹی میں فوجی ٹریننگ لے رہے تھے، اور میری منگنی کے آٹھویں روز انھیں بورڈ نے انتخاب کرکے جنگ پر بھیجدیا۔ اُسی دن سے میری ساری خوشیاں غم سے بدلیں اور پھر انھیں دوبارہ مسرتیں بننا کبھی نصیب نہ ہوا۔

جنگ کا ماحول سارے جہان کی فضا پر چھا گیا۔ جرمنی اور جاپان کا اُٹھان کچھ ایسا تھا کہ ساری دُنیا پر انہیں دو ملکوں کی بادشاہت کے آثار نظر آتے تھے۔ ہندوستان میں انسانی ڈھانچوں کے لئے اِس قدر کام مہیا ہوگیا کہ ہر گھر کے بوڑھے جوان اور عورتیں جنگ کے کاموں میں لگ گئیں۔ ملک کی جوان اور خوبصورت عورتیں نو وارد امریکینوں کے

کام آئیں۔ یہ بھی تو آخر ایک جنگی خدمت تھی ہندوستان میں تو شاید ہی کوئی خوبصورت لڑکی ایسی ہو جسے بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی نہ کسی امریکن سولجر سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ مجھے خود بھی اس حادثہ کا شکار ہونا پڑا۔ بات یہ ہوئی کہ کانوکیشن کے دن جیسے ہی سلیمان کے ساتھ ہال کے باہر نکلی تو ایک امریکن نوجوان نے بڑھ کر مجھے مبارکباد دی، وہ مجھ سے اردو زبان میں مخاطب ہوا اور تعجب یہ کہ اس کی گفتار میں بلا کی شیرینی بھی تھی۔ اس نے مجھے سلما کے نام سے پکارا جو در اصل میرا نام نہ تھا۔ مگر اُن دنوں امریکن ہر جوان اور خوبصورت لڑکی کو سلما ہی کہا کرتے تھے۔ انگریز سولجروں نے جن لڑکیوں کو لال بی بی کہہ کر خفا کر دیا تھا انھیں ان امریکنوں نے سلما کہہ کر خوش کر لیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ لڑکیوں کی اصطلاح میں ان امریکنوں کے لئے "سوداگر" کا لفظ چل نکلا تھا۔ اسوقت کی ڈپلومیسی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کوئی کسی کو اس کے اصلی نام سے نہ جان سکے۔ جنگ کو کسی نہ کسی طرح جیتنا تھا خواہ وہ سلما بن کر جیتی جاتی یا سوداگر بن کر۔ امریکن نے ہمیں اپنی جیب میں لفٹ دینا چاہی اور ہم دونوں اس جگہ پر بیٹھ گئے۔ راستہ بھر وہ اپنی باتوں سے ہم دونوں کو ہنساتا رہا۔ اُس کی اپنی تہذیب کا یہ تقاضا تھا کہ میں اس کے پہلو میں بیٹھوں اور ہوا بھی یہی۔ اُس نے جس بیباکی سے مجھے اپنے ساتھ بیٹھنے کے لئے کہا وہ اُسی کا حصہ تھا۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ وہ انتہائی معصومیت اور نیک نیتی سے مجھے مدعو کر رہا ہے۔ سلیمان تنہا ہم دونوں کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ دورانِ گفتگو میں سوداگر نے دو چار سوال مجھ سے

بہت دلچسپ کیئے مثلاً وہ سلیمان کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگا۔

"یہ آپ کے منگیتر ہیں؟"

مجھے اس کی ذہانت پر بڑا تعجب ہوا۔ کیونکہ اگر وہ سلیمان کو بجائے منگیتر کے میرا شوہر سمجھتا تو میں اسے انتہائی گاؤدی تصور کرتی۔ میں نے مسکرا کر کہا:۔

"آپ کو یہ معلوم کیس طرح ہوا؟"

"مدتوں میں نفسیات کا اسکالر رہا ہوں" وہ ہنس ہنس کر مجھے بتلانے لگا" حالانکہ میری اس پہچان کا کوئی تعلق نفسیات سے نہیں ہے۔ ہر لڑکی جو کالج کی باؤنڈری میں اپنے کسی نوجوان ساتھی کے ساتھ گھومے وہ اس کا منگیتر ہی ہو سکتا ہے۔ شوہر ہونے کے بعد تو ارادوں میں کبھی کمزوری آ جاتی ہے اور ہمتیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ شادی ہو جانے کے بعد آپ دونوں میں یہ شگفتگی نہ رہے گی جواب ہے" سلیمان نے پیچھے سے ہنسکر کہا:۔

"یہ امریکہ نہیں ہے میرے دوست، یہاں ہر لڑکی کا مطمح نظر صرف شادی ہے خواہ اُسے تم زندگی کی بہار سمجھو یا خزاں"

غرضکہ راستہ انھیں دلچسپ باتوں میں کٹتا چلا گیا۔ میرے گھر پر اُس نے مجھے اُتارا اور کچھ عجیب انداز سے اُس نے میرے گھر کے در و دیوار دیکھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اُن امریکن سولجروں سے کچھ مختلف معلوم ہوا۔ جو صبح سے شام تک حضرت گنج کی سڑکوں پر مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ کم از کم اُس میں اُن جیسا یہ چھچھوراپن

ہرگز نہ تھا اور یہی چیز مجھے اس کی بھاگئی۔ میں نے اُسے اخلاقاً چائے کی دعوت دیدی، سلیمان نے بھی اصرار کیا کہ وہ ہم سب کے ساتھ چائے پی کر جائے مگر اُس نے کچھ آمادگی نہ ظاہر کی اور اِس لئے مجبوراً ہمیں اُس کو چھوڑنا پڑا۔

اُس دن سلیمان بھی بہت تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے اور میں پھر اُسی امریکن کے خیال میں کھو گئی۔ امریکنوں کی بیشمار داستانیں سننے کے بعد میری جو اس امریکن سے پہلی بار ملاقات ہوئی تو مجھے کچھ عجیب سی مسرت ہوئی اسوقت تک میری جاننے والیوں میں کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جسے کوئی نہ کوئی سوداگر ملا نہ ہو بجز میرے۔ اور بس میں جب اس قسم کے تذکرے چھڑ جاتے تو میں خاموشی سے ہر ایک کا بیٹھی ہوئی منہ تکا کرتی۔ مجھے خوشی دراصل اِسی خیال سے ہوئی کہ جب کبھی کوئی ایسا ذکر آئیگا تو میں بھی زبان کھولنے کے قابل ہوں گی۔

یہ روزِ سعید طاہرہ باجی کی شادی کا دن تھا۔ سارے گھر پر مسرت و شادمانی کی فضائیں جھوم رہی تھیں۔ ابا میاں اور بھائی جان انتظامات میں لگے تھے۔ طاہرہ باجی دلہن بنائی جا رہی تھیں اور تمام گھر بھر کو کالج سے میری واپسی کا انتظار تھا۔ پھر جیسے ہی میں نے باہر سے گھر کے اندر قدم رکھا تو سب کے دلوں میں مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ ابا میاں میری ڈگری اور جسم پر زنانہ گاؤن دیکھ کر باغ باغ ہو گئے۔ بھائی جان نے دبی زبان سے مجھے مبارکباد دی، اس لئے کہ ان بیچاروں کو نہ ڈگری نصیب ہوئی نہ گاؤن ملا۔ طاہرہ باجی نے بھی دلہن کے کپڑوں میں سے حسرت بھری نظروں سے

دیکھا۔ عقیلہ مارے خوشی کے ناچنے لگی۔ ادر ابا میاں نے تو میری پیشانی پر اتنے بوسے دیئے کہ میرا جی اکتا گیا۔ غرضکہ اس ہیجانی کیفیت سے جب میں گذر چکی تو میں نے طاہرہ باجی کی زندگی پر غور کرنا شروع کیا۔ نہ معلوم کیوں میں ان کی اس شادی سے دوسروں کی طرح خوش نہ تھی۔ میرے ہونے والے بہنوئی بھی فوج کے کپتان تھے۔ جنگ کے اس زمانے میں ہمارا یہ گھر بدقسمتی سے فوجی لوگوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ابا میاں کی ریٹائرڈ زندگی۔ بھائی جان کی بے روزگاری۔ میری تعلیم کے مصارف، ان سب چیزوں نے ملکر ہر ایک کو چشم پوشی کرنے پر آمادہ کر دیا گھر کے اخراجات کا دارومدار انہیں آنے والے لوگوں پر منحصر تھا۔ ضروریات زندگی نے جو اس وقت انسان کی زندگی سے گراں تھیں سب کی زبانوں پر تالے چڑھا دیئے۔ امی جنت نصیب ہو چکی تھیں۔ ابا میاں کو اپنے سر سے یہ پہاڑ اتارنا تھے، اسی لیے جب طاہرہ باجی نے ان کپتان صاحب سے خلا ملا خاصی بڑھالی تو وہ معترض نہیں ہوئے بلکہ ان کے ذرا سے اشارے پر شادی کے لئے رضامند ہوگئے مجھے بھی اسی لئے میری مرضی پر چھوڑ دیا۔ عقیلہ کی صحیح تربیت کی طرف سے بھی وہ غافل تھے البتہ مجھے یہ فکر دامنگیر تھی کہ وہ ہم دونوں بہنوں کے نقش قدم پر نہ چلے تو کتنا اچھا ہو۔

کپتان صاحب کا نام یعقوب تھا اور انہیں طاہرہ باجی کی مخصوص پسند کہا جا سکتا ہے۔ جس روز گھر میں اس شادی کا ذکر چھڑا تو سب سے پہلی مخالفت میں نے ہی کی، اس لئے کہ میں نے ان کی بابت مختلف افسانے سُنے تھے

جن میں سے بعضوں کی تحقیق بھی ہو چکی تھی۔ مگر ان دلائل کے باوجود بھی میں کامیاب اس لئے نہ ہوئی کہ یعقوب ایک معزز عہدے پر فائز تھے، انہیں گیارہ بارہ سو روپیہ تنخواہ مل رہی تھی۔ اِس کے علاوہ طاہرہ باجی خود ان پر لٹو تھیں بلکہ بعد میں تو انہیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ یعقوب پر خود میری نظر ہے۔ غرضکہ نوبت جب یہاں تک پہنچی تو مجھے مجبوراً خاموش ہو جانا پڑا۔ مجھے یعقوب کے متعلق بہت سی معلومات تھیں مثلاً وہ شراب کثرت سے پیتے تھے اُن کی تعلیم کچھ نہ تھی۔ یہ اتنا بڑا عہدہ تو محض جنگ کا صدقہ تھا۔ اُس زمانے میں تو کمیشن گنگا جمنا کے پانی میں بہہ رہا تھا۔ اُس میں جس کا دل چاہتا ہاتھ دھو لیتا اُس زمانے میں تو خدا کی قدرت اگر نظر آتی تھی تو صرف کمیشن آفیسر میں۔ شاید ہی کوئی کندھا تین پھولوں سے خالی نظر آتا ہو۔ مگر یعقوب میں حسن بلا کا تھا۔ جسم اور ہاتھ پاؤں بھی بلا کے خوبصورت تھے، اور وردی پہنکر تو وہ اپنی خوبصورتی اور وقار کی اتنی بڑی ضمانت بنجاتے تھے کہ اُن کی تمام بُرائیاں پس پشت ہو جاتیں۔ میرا تو یہی خیال ہے کہ اچھائیوں اور بُرائیوں کا یہ امتزاج طاہرہ باجی کو کسی صحیح فیصلہ پر نہ پہنچا سکا اور وہ یعقوب کے ساتھ شادی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔

آج میں ہنستی ہوئی طاہرہ باجی کے عروسانہ بستر پر جا کر لیٹ گئی جس پر وہ دولھن بنی ہوئی بیٹھی تھیں۔ عطر اور اوبٹنے کی بھینی بھینی خوشبو جو باسی پھولوں کی مہک معلوم ہوتی تھی اُن کے جسم سے آ رہی تھی۔ مجھے وہ اتنی اچھی معلوم ہو رہی تھیں۔ گورے چٹے رنگ پر ریشمی اور جھپے دار کپڑے

اپنا صحیح مقام پاکر پھولے نہ سماتے تھے۔ طاہرہ باجی اسوقت ہر آرائش کا "شوکیس" بنی ہوئی بیٹھی تھیں لہٰذا حسن کی اتنی بڑی نمائش پر یعقوب جہاں تک تک نہ ناز کرتے کم تھا۔ مجھے فوراً خیال آگیا کہ اس امریکن کو میں نے نہیں روکا ورنہ اُسے شادی کا یہ شاندار آغاز ضرور دکھائی جو زندگی کے اس رشتہ پر مبنی تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ وہ گھر تو دیکھ ہی گیا ہے۔ اور کبھی نہ کسی دن ضرور آئے گا۔ اسوقت اُسے طاہرہ باجی سے ضرور ملواؤں گی۔ کم ازکم وہ بھی کیا یاد کریگا کہ کسی سلما سے سابقہ پڑا تھا۔

شادی کے بعد یعقوب کا تبادلہ لکھنؤ سے فیروزپور ہوگیا۔ طاہرہ باجی بھی انہیں کے ساتھ رخصت ہوگئیں اور میرے دل میں اُن کو دکھلانے کی حسرت تڑپ کر رہ گئی۔ نہ ان کی موجودگی میں وہ امریکن آیا اور نہ میں طاہرہ باجی کو دکھلاسکی۔ ایک دن وہ مجھے حضرت گنج کے ایک بار کی طرف جاتے ہوئے نظر آیا۔ اس روز میں تنہا تھی۔ میں نے اُسے آواز دی تو وہ مسکراتا ہوا میرے قریب آگیا۔ میں نے شکایت کی کہ اُس روز کے بعد پھر ملاقات ہی نہ ہوئی۔ اُس نے مجھے بتایا کہ اُس طرف اس کی دعوتیں بے شمار ہوئیں پھر اُس نے خود ہی مسکرا کر یہ ظاہر کیا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ میرے پاس نہ آنے کی تہیں ہے، وہ کہنے لگا:۔

"آپ کے لئے مقابلہ میں میرا آنا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے اُس روز کی ملاقات کو محض خواب سمجھ کر بھول جانے کی کوشش کی"

میں نے جواب دیا" مگر آپ لوگ محبت کے معاملہ میں کیا اس قدر پست نظر واقع ہوئے ہیں؟ کسی لڑکی میں اگر سٹار بننے کی صلاحیت نہ ہو تو اُس سے آپ راہ و رسم نہیں رکھتے"؟

"نہیں"۔

مجھے اُس کا یہ روکھا پھیکا جواب بہت بُرا لگا۔ اور فوراً ہی مجھے یہ محسوس ہوا گویا میں کسی غلط آدمی سے مل گئی ہوں۔ میں نے اُسی وقت سے یہ ارادہ کر لیا کہ آئندہ سے میں کبھی اس امریکن سے نہ ملونگی۔ میں نے مسکرا کر اس سے جانے کی اجازت مانگی تو اُس نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔

"اب آپ مِل گئی ہیں تو دو گھڑی کسی چائے خانے میں چل کر بیٹھئے میں آپ کی خاطر اپنا راستہ بدل دونگا۔ آپ اسوقت نہ ملتیں تو ڈرنک کرتا مگر آپ کی موجودگی میں شراب کی کیا ضرورت ہے؟"

"خوب۔ ایک طرف تو آپ مجھے سٹار نہیں سمجھتے اور یہ خیال آپ کا صحیح بھی ہے" دوسری طرف مجھے شراب سے بہتر کوئی اور چیز تصور کرتے ہیں"

"شراب کو تو میں دُنیا کی بدترین چیز سمجھتا ہوں خاتون" امریکن میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا" مگر میں اسکا قائل ہوں کہ اگر شراب اس دُنیا میں نہ ہوتی تو انسانیت دم توڑ چکی تھی"

"کس طرح"؟

"میں نے اپنی اتنی عمر میں بے حساب شراب پی" اور ضرورت سے زیادہ اس پر غور بھی کیا۔ شراب کو میں بُرا اس لئے سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنے پینے

والوں کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا اور ہمیشہ حلق سے نیچے اُترنے کے بعد اُن کے لئے شراب بن گئی۔ لیکن اس غم زدہ دُنیا میں اگر انسان کو اتنا سہارا بھی نہ ملتا تو وہ پاگل ہو جاتا۔ شراب مجبوراً پی جاتی ہے۔ کسی جذبہ یا شوق کی خاطر نہیں۔ امریکہ ایسا سرمایہ دار ملک بھی شراب پیتا ہے، لوگ دولت اور شراب کو عموماً ایک ہی خانہ میں رکھتے ہیں حالانکہ صحیح معنوں میں غم اور شراب کا ساتھ ہے۔"

"لیکن امریکہ ایسے ملک کو غم سے کیا واسطہ" میں نے اس کی بات کاٹ کر سوال کیا۔

"دولت دُنیا کے ہر غم کو ختم نہیں کر سکتی" امریکن نے مجھے جواب دیا دولت سے خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں لیکن اُس سے کسی غم کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔ لہٰذا شراب اگر وقتی طور پر ہی کوئی غم بھلانے پر مجبور کر دے تو وہ کوئی پائیدار چیز کہلانے کی مستحق نہیں۔ لیکن اگر یہ نہ ہوتی تو یہ خیالی خوشی بھی انسان کے لئے مفقود تھی۔"

ہم دونوں اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں پہونچکر اُس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام جیکسن ہے۔ پھر اُس نے میرا نام پوچھا مگر میں تھوڑے سے پس و پیش کے بعد مسکرا دی اور میری اس معنی خیز مسکراہٹ پر اُس نے کہا۔

"میں کل ہی اپنے ملک کی طرف روانہ ہو جاؤنگا اس لئے کہ میری واپسی کا حکم مجھے مل چکا ہے۔ میں نے تو اُس اسٹیج پر آ کر آپ کو اپنا نام بتایا ہے اور

اور آپ کا نام پوچھا ہے، جب اس کا کوئی مفہوم بھی باقی نہ رہا۔ کاش کہ ہم دونوں کچھ روز پہلے ایک دوسرے سے ملے ہوتے، لیکن پھر بھی کیا ہرج ہے اگر ہم دونوں ایک دوسرے کو محض ناموں سے یاد رکھ سکیں"۔

اُس کی یہ باتیں سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اُس کی گفتگو نے مختلف اثرات مجھ پر چھوڑے۔ میں نے سوچا کہ وہ شاید حرماں نصیب بھی ہے عاشق مزاج بھی اور شریف بھی۔ میں نے کہا:۔

"مجھے کوثری نام سے لوگ پکارتے ہیں"

"چائے ہم دونوں نے ساتھ ہی بیٹھ کر پی، وہ ہر گھونٹ کے ساتھ میرے نام کو دہراتا رہا جیسے اُسے زبانی یاد کر رہا ہو۔ پھر اُس نے کچھ عجیب التجا بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر کہا:۔

"اگر میں کوئی تحفہ آپ کو دوں تو اُسے آپ قبول کر لیں گی"

"جی نہیں" مجھے اُس کی اس پیشکش پر ایک دم سے انکار ہی کرتے بن پڑا۔

"آپ سے آپ کی کوئی نشانی طلب کروں"

"وہ بھی فی الحال میرے پاس نہیں ہے"

"بازار سے خرید کر دیدیجئے مجھے"

میں اُس کی اس بات کا کوئی جواب نہ دے سکی، چائے ہم دونوں کی پیالیوں میں ختم ہو چکی تھی، اس لئے وہ ہنستا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تمام ہندوستانی لڑکے ہم دونوں کو

تعجب بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اسی ہوٹل سے ملحق ایک بڑی دکان میں وہ اسی طرح ہنستا ہوا چلا گیا اور دوکان کے اندر تمام وہ چیزیں جو میری ضروریات یا شوق کی ہو سکتی تھیں خریدنے لگا۔ خریدی ہوئی چیزوں کی تعداد جب کافی بڑھ گئی تو مجھے دبی زبان سے کہنا پڑا۔

"مسٹر جیکسن یہ اتنی تمام چیزیں آپ کس کے لئے خرید رہے ہیں؟"

"اپنے لئے" وہ جواب کے ساتھ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔

"آپ کو اگر ان میں سے کسی چیز کی ضرورت ہو تو لے لیجئے۔"

میں نے شکریہ ادا کیا اور انکار میں گردن ہلائی خریدے ہوئے سامان کو جیکسن نے اپنی جیپ میں رکھوایا۔ کئی سو روپیہ بل ادا کرنے کے بعد اس نے یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے قریب لفٹ دی کہ اس رات میں وہ مجھے میرے گھر پر چل کر ڈراپ کر دے مگر میں ڈری کہ خدانخواستہ اس کی نیت میں کوئی فتور نہ ہو، مجھے اس کی جیپ میں بیٹھتے ہوئے انتہائی پس و پیش ہوا مگر میں انکار نہ کر سکی۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے جیپ اسٹارٹ کر دی۔ اس کا مجھے لیکر بھاگنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کے ہاتھ لگ ہی گئی۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ بلا کا شریف انسان تھا اس نے مجھے میرے گھر پر لا کر اتار دیا۔ میں نے نوکر کو آواز دی کہ اس سے باہر کا کمرہ کھلوا کر ذرا دیر اس کو اپنے پاس بٹھا لوں۔ مگر اس نے انکار کیا۔ وہ کہنے لگا۔

"آج میں بیحد مضمحل ہوں اور آپ سے مل کر اور زیادہ رنجیدہ ہو گیا۔

اس لئے اب مجھے واپس چلا جانے دیجئے۔ کل میں اپنے ملک واپس جا رہا ہوں۔ اپنے وطن۔ مجھے اتنے لمبے سفر کی تیاریاں بھی کرنا ہیں۔ کاش کہ ہندوستان میرا ملک ہوتا۔ میں اس جگہ کو نہ معلوم کیوں اپنا وطن سمجھنے لگا ہوں۔ میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا مگر جا رہا ہوں ——

اور اسی قسم کی دو چار باتیں کرنے کے بعد اُس نے جیپ سٹارٹ کر دی۔ میں اُس سے ہاتھ ملا کر بادل ناخواستہ اندر آ گئی ملازم وہیں کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر جب وہ بھی اندر آیا تو اُس کے ہاتھوں میں اُن تمام چیزوں کا ایک بہت بڑا بنڈل موجود تھا جو جیکسن نے اپنے لئے خریدی تھیں۔ میں فوراً ہی جیکسن کے لئے پھر بھاگی ہوئی باہر آئی مگر اب وہ کہاں تھا۔ میں اپنے دل میں سوچنے لگی کہ اتنے دور دیس کا رہنے والا جیکسن اب شاید ہی کبھی مجھے زندگی میں مل سکے!

پھول والی گلی

چمپا کے گجرے اور منگو کمہار کی صراحیاں، گرمیوں میں ہمارے شہر کی خاص یادگاریں ہیں۔ اب نہ چمپا ہے نہ منگو۔ مگر بہتوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ گجرے چمپا بناتی ہے اور صراحیاں منگو۔ یہ باتیں میرے زمانے کی نہیں ہیں۔ مگر بزرگوں سے ان کے بڑے بڑے چرچے سنے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ چمپا کے گجروں کا یہ حال تھا کہ اس کا ایک ہار گلے میں ڈال کر نکلو تو سارا محلہ خوشبو سے بس جاتا تھا۔ اسی طرح یہ روایت مشہور ہے کہ منگو سال میں صرف بیس صراحیاں بناتا تھا اور وہ گرمی شروع ہونے سے پہلے ہی بک جاتی تھیں۔ اب بھی یہ دونوں دکانیں موجود ہیں اور خوب چلتی ہیں۔ ان پر بڑے بڑے تختے لگے ہیں۔ ایک پر لکھا ہے چمپا کے گجرے اور دوسرے پر لکھا ہے منگو صراحی والا۔ یہ دونوں قدیم دکانیں ایک گلی کے اندر ہیں جو پھول والی گلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں پھولوں کی دکانیں بہت ہیں اور شام کو جو چہل پہل یہاں ہوتی ہے شاید شہر کے کسی حصہ میں نہیں ہوتی۔

اس گلی میں زیادہ بھیڑ بھاڑ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گلی کے

فوراً ہی بعد ایک چوک ہے جہاں کے تمام تماشبین اسی گلی سے ہو کر گزرتے ہیں اس گلی میں پھولوں کی دورخی دکانیں بہت دور تک چلی گئی ہیں اور سب سے آخر میں چمپا کی دوکان ہے پھر اس کے بعد منگلو صراحی والے کے آس پاس پھولوں اور صراحیوں کی بہت سی دوکانیں ہیں مگر جتنے پیسے ان دونوں دوکانوں میں آتے ہیں شاید گلی بھر کی دوکانوں میں نہ آتے ہوں۔ چمپا کی دوکان پر ایک جوان لڑکی پھولوں اور گجروں کی ٹوکریاں لئے بیٹھی رہتی ہے کچھ گجرے کھلے ہوئے پھولوں کے ہوتے ہیں اور بعض منہ بند کلیوں سے گندھے ہوئے۔ منگلو کی دوکان پر ایک بڈھا خرانٹ بیٹھکر اونگا کرتا ہے۔ پھول اور مٹی میں جو مناسبت ہے وہی پھول بیچنے والی لڑکی اور صراحی بیچنے والے بڈھے میں ہے۔ لڑکی جتنی ہنس مکھ اور خوش رو ہے بڈھا اتنا ہی اکھڑ اور بدمزاج۔

رات دن میں نہ جانے کتنے منچلے اس گلی سے گذرتے ہیں۔ کچھ گاتے ہوئے کچھ ہنستے ہوئے اور کچھ اس طرح نیچی گردن کئے ہوئے کہ اگر ضرورت نہ ہوتی تو اس گلی میں نہ آتے۔ پھول بیچنے والے گجرے بناتے بناتے اکثر بابا فقیر خاں کا یہ دادرا گانے لگتے ہیں "چلے جاؤ بدردا" اکثر طوائفیں بھی اس گلی میں آ نکلتی ہیں اور اس آن بان کے ساتھ گویا گلی ان کے باپ کی ہے۔ جس دوکان پر پہنچ گئیں ایک آدھ گجرا اٹھا لیا۔ یا کسی نے خود ہی گجرا ان کے گلے میں ڈالدیا۔ ان کے آتے ہی ایک قسم کا طوفان بدتمیزی گلی کے اندر سما جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے "لاڈلی صبح سے یہ گجرا تمہارے انتظار میں رکھ چھوڑا ہے۔ قسم ہے پالنے والے کی بارہ آنے تک ملا گئے اور نہیں دیا اور تم نے صبح سے شکل ہی نہ دکھائی" طوائف ذرا

نخرے سے بولتی" اور کیا نگوڑے ایک گجرے کے لئے میں اتنی دور سے چل کر آتی کبھی کوئی اچھا سا گہنا بنا کر دیتے تو ہاں یہ بھی سمجھتی کہ مجھے چاہتے ہو۔

اور پھر دوسرے دوکاندار ان پر آوازے کسنے لگتے اکثر معزز اور خاندانی طوائفیں بھی اس گلی سے گذرتی ہیں۔ مگر اپنے کو لئے دیئے ہوئے۔ راستے بھر میں انہیں دو چار فرمائشی سلام کئے جاتے ہیں۔

"آداب عرض ہے بائی خورشیدی۔ مزاج تو اچھے ہیں؟"

"مہربانی ہے حضور کی۔ آپ کے مزاج؟ یہ آخر آنا کیوں چھوڑ دیا آپ نے؟"

اس قسم کی رسمی خودداری کے ساتھ انہیں بائی جی جواب دیتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔ اکثر بے تکلف دوکاندار ان کی شان میں گستاخی کرتے ہیں۔ کوئی ان سے کہتا "تم آئیں گھر میں ہمارے کھدا کی گدرت ہے" اور کوئی انہیں دیکھ کر فانی کا یہ مصرعہ پڑھنے لگتا "کفن سر کا دُ میری بے حجابی دیکھتے جاؤ" اور بائی جی مسکراتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔

گلی کے نکڑ پر جہاں سے چوک بازار شروع ہوتا ہے۔ وہاں شاہی زمانے کا ایک امام باڑہ ہے۔ بوسیدہ۔ ٹوٹا پھوٹا۔ اپنی حالت پر خود نوحہ خواں۔ اس کے نیچے کے حصہ میں کمہار بسا دیئے گئے ہیں اور اوپر کا حصہ غریب طلباء کو مفت رہنے کے لئے دیدیا گیا ہے۔ ان طالبعلموں میں میرا ایک دوست ارشد ہے اسی امام باڑہ کی طرح مسکین اور غمزدہ۔ یہ میرا بہت جگری دوست ہے میں روز شام کو اس سے ملنے جاتا ہوں۔ گلی سے گزرتے وقت مجھے کچھ گدگدی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ کبھی کسی سے کندھا لڑ گیا۔ کبھی کسی کے جسم کو بچا کر نکل گیا

کبھی کبھار کوئی دوکاندار دیکھ کر پکار اٹھتا "او میاں صاحبزادے ایک ہار لیتے جاؤ" چمپا کی دوکان کے سامنے گزرتے ہوئے میں ایک اچٹتی ہوئی نظر لڑکی پر ضرور ڈالتا ہوں اس کی دوکان پر ہر وقت لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ لڑکی مسکرا مسکرا کر سب کو گجرے دیتی رہتی ہے کبھی دفعہ دل چاہا کہ اس کی دوکان پر کھڑے ہو کر ایک گجرا خریدوں مگر ہمت نہ پڑی۔ کسی نے دیکھ لیا تو کیا کہے گا "لڑکی سے گجرا خریدتا ہے" اور میں تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا امام باڑے میں داخل ہو جاتا ہوں۔

ارشد جس کمرے میں رہتا ہے اس کی کھڑکیاں اسی گلی کی طرف کھلتی ہیں اگر ساری کھڑکیاں ایک ساتھ کھول دی جائیں تو بہت دور تک اس گلی کی چہل پہل اور آمد و رفت دکھائی دیتی ہے ایک کھڑکی تو بالکل چمپا کی دوکان کے سامنے ہی ہے میں زیادہ تر اسی کھڑکی کو کھول کر بیٹھا رہتا ہوں اور اس لڑکی کی دوکانداری دیکھا کرتا ہوں ایک آیا۔ دو آئے۔ تین آئے۔ غرض دن بھر آدمیوں کا تانتا لگا رہتا ہے پھر ایک چیز کی بکری نہیں ہوتی کوئی دلہن کا گہنا مانگتا ہوا آتا ہے۔ تو کوئی نوشہ کے سہرے دو چار دس منچلے دن بھر میں پھولوں کے بستر بھی خرید کر لیجاتے ہیں۔ جو پھولوں کی سیج کے نام سے مشہور ہیں۔ یہی حال ملی ہوئی منگلو کی دوکان کا ہے۔ اس کی سینکڑوں صراحیاں ہاتھوں ہاتھ نکلی چلی جاتی ہیں۔ بڈھے کی بدمزاجی اور اکھڑپن کا کوئی خاص اثر دوکانداری پر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ لوگ اب عادی ہو گئے ہیں۔ گاہک نے صراحی لی۔ اسے اچھے سے بجایا۔ پھر بولا "بڑے میاں! اس میں ٹھناکے کی آواز نہیں آتی۔ کہیں ٹوٹی ہے؟"

بڈھا گڑ جاتا اور پیسے گاہک کے سامنے پھینک کر کہتا۔ "بہت سی دوکانیں

موجود ہیں گھوم آئیے۔ لوٹ کر آئیے گا تو دگنی قیمت پر دوں گا۔ بولتی نہیں! بولتی نہیں! کیا کوئی انسان ہے جو بولے ؟"

دوسرے دوکاندار گیدڑوں کی طرح غل مچاتے۔ ادھر آئیے، ادھر آئیے جناب اجی یہ دیکھئے جھجری دار صراحی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔" اجی یہ لیجئے بابو صاحب! چھ مہینے پورے بالو میں گڑی رکھی رہی ہے۔ جب پانی بھر کر پیجئے گا۔ تب کہئیے گا۔ اور تیسرا اپنی دوکان سے چلا کر کہتا۔ یہ صراحی نہیں بابو صاحب! چشمہ ہے چشمہ پانی میں آبِ زمزم کا مزہ نہ آئے تو میرا ذمہ" غرض اس چاؤں چاؤں میں گاہک خود گھبرا جاتا ہے۔ اور کسی طرف چپکے سے چل دیتا ہے۔ یہ بڈھا بڑا ہوشیار اور زمانہ شناس ہے وہ چاؤں چاؤں کی قطعی پرواہ نہیں کرتا۔ جب کوئی گاہک ایک بڈھے کی دوکان سے لوٹ جاتا ہے تو وہ صراحی کو وہیں چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ جیسے اس بات کا یقین ہو کہ ابھی پھر آکر لے جائے گا۔

سرِ شام چمپا کی دوکان کے سارے گجرے ایک آدمی لے کر چوک کے بازار میں چلا جاتا ہے۔ عجیب خوش بیانی اور ترنم کے ساتھ وہ سارے بازار کا چکر لگاتا ہے۔ "ہار بیلے کے ہیں گجرے جوہی کے ہیں" کوٹھوں کے اوپر سے طوائفیں اپنی جھمپوں میں ڈوریاں باندھ کر نیچے لٹکا دیتی ہیں وہ اُن میں ہار ڈال دیتا ہے اور پھر جھمپیاں اوپر کھینچ لی جاتی ہیں۔

اس سڑک پر چلنے والے نہ سامنے دیکھتے ہیں اور نہ دائیں بائیں۔ سب کی نگاہیں اوپر لگی رہتی ہیں۔ اکثر مختلف سمتوں سے آنے والے لوگ آپس میں ٹکرا جاتے ہیں اور پھر خفیف ہو کر ایک دوسرے سے معافی مانگنے لگتے ہیں۔

یہاں کی تمام طوائفیں شام کو اپنے کمروں سے نکلکر چھجوں میں بیٹھتی ہیں اور اپنے حسن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ انہیں سے کچھ ایسا نہیں کرتیں اور ان کے کمروں سے گھنگھروں کی گونج راگ راگنیوں کی گیتیں اور مختلف قسم کا شور وغل سنائی دیتا ہے

جسم فروشی کا یہ بازار ساری رات اسی طرح جگمگا کر صبح ہوتے ہوتے خاموش ہو جاتا ہے بجنسہ اس گھر کی طرح جہاں سے باراتی دلہن کو لے جا چکے ہوں۔ ارشد کو یہ نظارے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ ٹھوس اور سنجیدہ طبیعت کا انسان ہے۔ جب کبھی میں نے اس سے چوک چلنے پر اصرار کیا اس نے کچھ نہ کچھ بہانہ کر دیا۔

"ارے یار کیسے جوان ہو؟ میں نے باتوں باتوں میں کہا۔

وہ بولا "میں بچپن سے سیدھا بڑھاپے میں داخل ہو گیا ہوں۔ جوانی تو تمہارا حصہ ہے۔ تم ہی اسکے مزے اڑاؤ۔"

"چہ بڑھاپا۔ بڑھاپا، عجیب آدمی ہو۔ اماں پھر پیدا ہی کیوں ہوئے تھے اور یا پھر بچپن سے سیدھے قبر میں داخل ہو جاتے۔ چلو اٹھو آج تمہارے بڑھاپے کا علاج ہو جائیگا

غرض بہت تو تو میں میں کے بعد وہ چلنے پر راضی ہوا۔ آج صبح ہی سے میرے دماغ میں اس قسم کے خیالات آ رہے تھے۔ مہینے کی پہلی یا دوسری تاریخ تھی اور جیب خرچ جو کچھ ملا تھا وہ ویسا کا ویسا ہی موجود تھا۔

"یعنی کیا ذہنیت ہے" ارشد چلتے چلتے بگڑ کر بولے "چمپا کی دوکان پر جایا نہیں جاتا اور چوک کی سیر کرنے چلے ہیں۔ آخر تم اتنی ہمت کس طرح کر سکو گے؟"

"جس طرح آپ نے بچپن سے سیدھے بڑھاپے میں داخل ہونے کی ہمت کی۔ سو چونہ بالکل وہی بات ہے۔ آپ جوانی پھاند گئے ہیں چمپا کی دوکان پھاندے جاتا ہوں"

مگر میں نے فطرتاً ایسا گیا۔ اور تم فطرت کے خلاف ایک کام کرنے جا رہے ہو۔"

"نہیں نہیں، جو کچھ تم نے کیا وہ فطرت کے خلاف کیا اور میں جو کچھ کر رہا ہوں

وہ عین فطرت ہے۔ دیکھو ابھی اس کا اطمینان ہوا جاتا ہے۔"

اس قسم کی باتوں سے راستہ کٹتا چلا گیا۔ نکر ملکی حد سے گزر کر جب وقت ہم

بازار میں داخل ہوئے تو ایک بڑی بی نے آکر سلام کیا مزاج پوچھا، پھر ارشد کی طرف

دیکھ کر کہنے لگیں۔ کہاں تھے میاں صاحبزادے میں تو روز آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا

کرتی تھی۔"

ارشد تو سٹ پٹا سا گیا۔ اور میں یہ سمجھا کہ بڑھیا ضرور ارشد کی کوئی عزیز یا ہم وطن ہو

اور سرے سے بسم اللہ ہی غلط ہو گئی۔ اسی طرح اگر کوئی میرا عزیز مل گیا تو صبح کو خوب گت بنے گی

"چلئے کہیں گھما لاؤں۔" بڑھیا ذرا مسکرا کر بولی۔

"گھومنے تو ہم آئے ہی ہیں۔"

"آہستہ آہستہ بولئے۔" بڑھیا نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔ آپ لوگ شریف ہیں۔

کوئی سن لیگا تو کیا کہیگا۔"

"کہاں گھمانے لے چلوگی؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"پرستان کی سیر کراؤں گی، وہ پریاں دکھاؤں کہ آپ اپنی مثال ہوں۔ آیئے

میرے پیچھے پیچھے چلے آیئے۔"

اتنا کہہ کر وہ ایک اور گلی میں مڑی اور ہم دونوں پیچھے پیچھے چل دیئے۔

ارشد نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"ارے ڈائن ہے ڈائن، چلو لوٹ چلو۔"

"چلو بھی پرستان نہ چلو گے؟"

بڑھیا نے پیچھے مڑ کر کہا "ہولے ہولے باتیں کیجئے میاں، آپ لوگوں کو اپنی عزت آبرو کا خیال نہیں"

پھر ہم دونوں خاموشی کے ساتھ راستہ طے کرنے لگے۔ گلی در گلی گھومتے گھماتے آخر کار ہم دونوں پھر اسی پھول والی گلی میں پہنچ گئے۔ اب بڑھیا کے قدموں کی رفتار سُست پڑنے لگی۔ آخر کار اس نے ایک دروازے پر پہنچ کر دستک دی۔

کھولتی ہو کہ لوٹ جاؤں؟"

"کون! لوا کریمن؟" اندر سے آواز آئی۔

"ہاں ہاں کھولو تو سہی!"

ایک کمسن لڑکی نے آکر دروازہ کھولا۔ پھر بولی "سلام لوا کریمن"۔

"جیتی رہو ـــــ آیئے سرکار" کریمن نے پیچھے مڑ کر ہم دونوں کو دعوت دی یہ ایک بوسیدہ سا گھر تھا۔ چھوٹا سا آنگن، سامنے ایک دالان۔ اور اسی سے ملا ہوا ایک زینہ کوٹھے پر چلا گیا تھا۔ ہم دونوں بن بلائے مہمانوں کی طرح آنگن میں جاکر کھڑے ہو گئے۔

"چلو میاں اوپر بالاخانے پر" کریمن خوش ہو کر بولیں۔

"بہت اچھا" اور ہم دونوں کھٹ کھٹ کرتے اوپر پہنچے جہاں ایک دوسری صاحبہ پلنگ پر صاف چادر لگا رہی تھیں۔"

"تسلیم" وہ ذرا آنکھیں مٹکا کر کہنے لگیں۔

"سلام! سلام!" ہم دونوں نے یکے بعد دیگرے جواب دیا۔

"آیئے بیٹھئے!"

ہم دونوں بیٹھ گئے۔

"گرمی بہت ہے شیروانیاں اتار دیجئے نا؟"

ہم نے شیروانیاں اتار کر ٹانگ دیں۔

"کچھ باتیں کیجئے"

"جی — جی —" ہم دونوں نے باری باری کہا۔

اتنے میں پہلی والی صاحبہ بھی اوپر آگئیں۔ اور انھوں نے ہم دونوں کو لیٹ جانے کی دعوت دی۔

ہم دونوں ایک ساتھ لیٹ گئے۔

"کیا آپ لوگ پہلی مرتبہ یہاں آئے ہیں؟" ایک صاحبہ نے ہنس کر پوچھا۔

"جی ہاں، جی ہاں" ہم دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

"اچھا آپ دونوں الگ الگ پلنگوں پر بیٹھئے" دونوں نے ایک دوسرے کو ہنستے ہوئے دیکھ کر کہا۔

ہم دونوں ایک ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئے۔

ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے دوسری طرف چھت پر لیکر چلی گئی۔ یہاں بھی ایک پلنگ پہلے سے بچھا ہوا تھا۔ سرہانے پانی سے بھری ہوئی صراحی رکھی تھی اور تکیہ پر بیدردی سے کچھ گجرے بکھرے پڑے تھے۔ میں پلنگ کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"اب بیٹھئے نا؟" وہ بولی۔

"اور آپ؟"

"میں پہرہ دوں گی۔"

"تو آپ بیٹھئے میں پہرہ دونگا؟" میں نے جی کڑا کرکے جواب دیا۔

"اور جو ہم اور آپ دونوں ——" لڑکی نے اتنا کہہ کر سامنے والے چراغ کو پھونک مار کر بجھا دیا۔

اتنے میں کہیں دور سے پہرہ والے نے صدا لگائی۔ "جاگتے رہیو!"

"کچھ باتیں کیجئے!" وہ بولی۔

"تھوڑا سا پانی پلائیے۔ میرا حلق خشک ہو گیا ہے۔"

اس نے صراحی سے پانی انڈیل کر دیا۔

"آہا کتنا ٹھنڈا پانی ہے۔ کیا یہ صراحی منگلو کی دوکان کی ہے؟"

"جی ہاں!"

"اماں ارشد!" میں نے پکار کر کہا۔ "منگلو کی صراحی کا پانی ——"

"آئیں آپ یہ کیا کرتے ہیں؟ ان کو اس وقت پکارنے کی کیا ضرورت تھی؟ توبہ توبہ شرم نہیں آتی آپ کو۔ دیکھئے وہ کہیں کچھ بولے؟"

"ہاں حماقت تو کی میں نے بھول گیا تھا۔ معاف کیجئے گا!"

"خبردار اب کوئی حماقت نہ کیجئے گا۔"

"نہیں نہیں آپ اطمینان رکھیں۔ اور یہ ہار کہاں کے ہیں؟"

"یہ ہار —— چمپا کی دوکان کے ہیں؟"

"اہاہا! بھئی کیا پیاری خوشبو ہیں۔ آپ روز چمپا کے ہار خریدتی ہیں؟"

"روز ــــــ !"

"آپ کہیں تو ایک ارشد کو دے آؤں؟"

"پھر وہی! کیا مردوں میں شرم وحیا بالکل نہیں ہوتی؟"

"او بھول گیا ــــــ اُن سے تو ملاقات ہی نہیں ہو سکتی معاف کیجئے گا۔"

"توبہ ہے! ــــــ معافی مانگنے اور معافی دینے میں ساری رات کٹ جائے گی۔"

"تو پھر کیا سو رہوں؟"

"نیند آ رہی ہو تو ...."

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہرہ والے کی صدا پھر کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔ "جاگتے ــــــ رہیو!"

صبح تڑکے میری آنکھ کھلی۔ نیچے ڈھابلی میں کوئی مرغا گُڑوں کوں کا شور مچائے ہوئے تھا۔ میں جلدی سے اُٹھا۔ سوچا کہ ارشد کو چل کر جلدی سے جگا دوں مگر وہ پہلے ہی سے جا چکا تھا۔ میں نے جلدی جلدی اپنی اچکن پہنی۔ جیبیں ٹٹولیں تو خالی ــــــ مجھے اپنی غلطی کا احساس بری طرح ہوا۔ گھر سے نکلا تو گلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اُمسی ہوئی گرمی میں لوگ چارپائیوں پر بیہوش پڑے مارتے تھے۔ دکانیں سب بند تھیں۔ جگہ جگہ باسی پھول پڑے تھے صراحیوں کے کچھ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں کتے چپڑ چپڑ

پانی پی رہے تھے۔ اتنے میں چھپاکی دوکان کا ایک پٹ کھلا اور وہی لڑکی جھاڑو لئے ہوئے باہر نکلی اور مجھے دیکھ کر پھر اندر گھس گئی۔ آگے بڑھا تو بڈھا صراحی والا نوتم ہاتھ میں لئے بم پولس سے نکل رہا تھا۔ میں نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ جیسے ہی میں نے امام باڑے کے پھاٹک پر قدم رکھا مؤذن نے کہیں دور سے آذان دی ـــ اللہ اکبر! ـــ ساتھ ہی کسی مندر سے گھنٹہ بجنے کی آوازیں آئیں۔ کمرہ میں پہنچا تو ارشد بولا "شب بخیر" مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری زبان کوا لے گیا ہے!۔

جنازہ

اپریشن کے بعد عموماً ایک گھنٹی بجتی ہے، اور وہ بجے جا رہی تھی، ایسی بھیانک اور ڈراؤنی جیسے موت اور زندگی لڑ چکنے کے بعد ایک ساتھ غل مچا رہی ہوں۔

اسپتال کی سکون پرور اور خاموش فضا میں سب دم بخود اسی گھنٹی کی آواز سن رہے تھے۔ آواز سے دو بول پھوٹتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بجکر تو جیسے پوچھتی ہو، کیا ہوا؟ اور کیا ہوا دوبارہ ٹن ٹنا کر کہتی۔ کیوں بتائیں کیوں بتائیں۔

مغربی تہذیب اپنے بعض اصولوں میں اسی طرح تکا بھن نظر آتی ہے۔ سارا اسپتال امید و بیم کی حالت میں ڈوبا ہوا اس گھنٹی کی آواز سن رہا تھا اور وہ بجے جا رہی تھی، ہر مریض کو آواز پہچاننے کی جستجو تھی، موت اور زندگی کی ملی جلی آواز ہر شخص کی نگاہوں میں ایک بے چین انتظار کروٹ لے رہا تھا۔

میں اسپتال میں داخل تھا۔ یہ گشتی اسپتال مختلف محاذوں کے ساتھ ہر جگہ منتقل ہوتا رہتا تھا، آج ایک جگہ ہے کل دوسری جگہ ان دنوں یہ اسپتال مصر کے کسی ٹاپو میں خانہ بدوشوں کی طرح آباد تھا۔ جنگ کے زخمی لوگوں کی تعداد بڑھتی

جاری تھی اور ہر وارڈ میں مریض تلے اوپر اسطرح بھرے تھے جیسے شیرے پر مکھیاں گڈ مڈ ہوتی ہیں۔

پہلے میں اپنے چھوٹے سے وارڈ میں تنہا تھا۔ مگر پھر تین مریض اور آگئے جگہ کی قلت کے باعث انہیں تین بڈ (BEDS) زبردستی اور ٹھو نسے گئے۔ مجھ سے ملا ہوا ایک چھتری رگھوبیر سنگھ بڈ تھا جو درد گردہ کا مریض تھا تیسرے بڈ پر ایک بنگالی مسٹر بین تھے جن کی ناک سے خون اور کیڑے گرا کرتے تھے۔ چوتھا بڈ ایک مسلمان سپاہی کریم خاں کا تھا جو خالی تھا اور اپنے مالک کی موت اور زندگی کے لئے خود ایک سوال بنا ہوا تھا۔

دو نرسیں ایک اسٹریچر گاڑی کھینچتی ہوئی نکلیں۔ انھوں نے اپریشن روم کے صدر دروازہ پر پہونچکر شیشوں سے اندر جھانکا اور گاڑی سے ٹیک لگا کر مریض کے انتظار میں کھڑی ہو گئیں۔

اب گھنٹی بجنا بند ہو گئی تھی۔ اور اسپتال کی خاموشی اور زیادہ گہری ہو کر سرگوشی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ کریم خاں کا بڈ سب سے آخر میں آیا تھا اور سب سے پہلے خالی ہو گیا اسکا سر گولی کا نشانہ بنا تھا، چوٹ بہت شدید تھی۔ گولی اپنے ساتھ سر کے تمام بھیجے کو باہر نکال لائی تھی اور اب زخم میں ناقابل برداشت بدبو پیدا ہو گئی تھی۔ اسوقت اسکا آپریشن تھا جس کی موت اور زندگی کی پہیلی اس گھنٹی سی بجھائی جارہی تھی۔

نرسیں کریم خاں کے بڈ پر ایک انگریز سارجنٹ کو لٹا کر چلی گئی تھیں اور اب ہم پھر چار ہو گئے تھے۔ سارجنٹ کے بائیں ہاتھ میں گولی لگی تھی اور درد کی شدت کے باعث

اسکے منہ سے ایک خوفناک کراہ نکل رہی تھی جس وقت نرسیں اسٹریچر پر لٹا کر اس سارجنٹ کو لائی تھیں تو رگھوبیر سنگھ بہت خوش ہوا تھا۔ پہلے اس نے سارجنٹ کو سلوٹ جھاڑا پھر اسکے ٹوٹے ہوئے ہاتھ کو بہت غور سے دیکھنے لگا جس پر پلاسٹر کی بہت موٹی چادر چڑھی تھی اور وہ اتنا موٹا تھا جیسے کسی پہلوان کی ران۔

میں نے پوچھا۔ یہ تمہارا افسر ہے؟

جی ہاں!

ہاتھ ٹوٹ گیا ہے؟

جی ہاں! اور وہی بایاں ہاتھ جس سے اس نے رائفل کا دستہ میرے پیٹ میں گھسیٹ کر مارا تھا۔ اس ہاتھ سے اس نے بڑے بڑے ظلم کئے ہیں۔

بیوقوف! جہاں گولیاں چلتی ہوں، زندگیاں برباد ہو جاتی ہوں وہاں دستہ مار دینا بھی کوئی ظلم ہے؟

رگھوبیر سنگھ ایک وحشی قسم کا کم عقل انسان تھا کہنے لگا یہ تو سچ ہے مگر ایشور جانتا ہے کہ اس روز سے مجھے درد گردہ کی شکایت پیدا ہو گئی۔ آپ ہوتے تو دیکھتے اس نے بھرپور ہاتھ میرے پیٹ پر مارا تھا میں بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔

مسٹر سین جو کسی خیال میں محو تھے اکدم سے چونک پڑے جیسے انھیں کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو۔ بولے یہ آپ کیا کہتے ہیں۔

لڑائی کے میدان میں پیٹ پر رائفل کا دستہ ماردینا اتنی ہی چھوٹی بات ہے جیسے ہندوستان میں آ کر تجارت کرنا۔ اگر تجارت حکومت کے ساتھ بدل سکتی ہے تو کیا درد گردہ موت سے نہیں بدل سکتا اور پھر مسٹر سین نے اپنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

میں کسی زمانہ میں باکسنگ کا بادشاہ تھا۔ بڑے بڑے انگریز پہلوانوں نے میرا لوہا مان لیا تھا۔ اپنی پلٹن میں جوان ہیکل گوروں کی گردنیں تو میں پکڑ کر اس طرح لڑا دیتا تھا جیسے مٹی کے دو بوے ہوں۔ اس وقت شاید آپ میری ان پتلی کلائیوں کو دیکھ کر یقین نہ کریں اور مجھے جھوٹا سمجھیں مگر میں سچ کہتا ہوں ان ہاتھوں سے میں نے جنگلی سانڈوں کی گردنیں تک موڑدی ہیں۔ بارہا ایسا ہوا کہ میری بارک کی حدوں میں ایک جنگلی سانڈ آگیا اور میں نے اس کے دونوں سینگ پکڑ کر اس کی گردن مروڑ دی۔ ان ہاتھوں میں بلا کی قوت تھی ۱۹۲۲ء میں ہندوستان سے منتخب ہو کر ولایت گیا وہاں مسٹر ھارڈی ایک انگریز سے میری کُشتی تھی۔

مگر بیان کرنے کا یہ کونسا انداز ہے سانڈوں کے ساتھ مسٹر ہارڈی کا کیا ذکر؟

جی ہاں! یہ ایک انگریز سانڈ تھا، ویسا ہی جید لحیم وشحیم، اس کے پٹھوں کی رگیں اتنی موٹی تھیں جتنی آپ کی انگلیاں، پہلے میری اس کی کشتی ہوئی پھر مُکّا بازی، اور فتح مجھے نصیب ہوئی، کیا زمانہ تھا وہ ـــــ اگر اس وقت کا ایک سکنڈ مجھے ساری زندگی کے بدلے میں دیا جائے تو میں ضرور منظور کرلوں گا۔ میچ ختم ہو جانے کے بعد نہ جانے کس قدر لڑکیوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اکثر نے میرے ہاتھوں پر بوسہ دیا، پھر اُس رات کو جب میں اپنے بستر پر رنگین اُمیدوں کے ساتھ سو رہا تھا۔ میرا یہ حشر ہوا جس حالت میں آپ مجھے اس وقت دیکھ رہے ہیں!۔

یعنی دماغی بیماری ہوگئی اور ناک سے خون آنے لگا۔

جی نہیں مجھے سینکڑوں نے آکر گھیر لیا اور میری گردن اور سر پر گھونسے مارنا شروع کئے اور اتنے مارے کہ میری ناک سے خون آنے لگا۔

اتنا کہنے کے بعد مسٹر سین نے تسلے میں اپنا سر جھکا دیا اور اُن کی ناک سے خون اور کیڑے گرنے لگے۔

اب مجھے بھی ۳۲ء کا وہ زمانہ دھندلا سا یاد آنے لگا جب ان کے فوٹو اخباروں میں نکلے تھے۔ ان کے ولایت جانے پر ہندوستان نے انھیں غازی صدر کا لقب دیا تھا۔ ان کی زندگی کے حالات بھی اخباروں میں شائع ہوئے تھے۔ میں نے یہ سب کچھ سوچ کر بہت غور سے مسٹر سین کے چہرے کو دیکھا اور انھوں نے بمشکل اپنے جھکے ہوئے سر کو تھوڑا سا اٹھا کر صرف اتنا کہا —— میرے ہندوستان آنے سے قبل بے ایمانوں نے یہ پروپیگنڈا کیا کہ میں دھاڑی سے شکست کھا گیا اور اتنا کہہ کر وہ پھر ٹپ ٹپ خون کی بوندیں تسلے میں گرانے لگے۔

رگھوبیر سنگھ نے اُٹھ کر مسٹر سین کا سر پکڑ لیا۔ اور کہنے لگا سُنا آپ نے میری تو کئی پُشتیں اس محکمہ کی ملازمت میں گزر گئیں دو برسوں سے میں خود ملازم ہوں۔ سانپ کا بچہ بل ہی کھودتا ہے۔ میں لڑائی کے سارے کرتب جانتا ہوں، قوم کا چھتری ہوں کسی بات سے نہیں ڈرتا۔ میں نے ایسے اچھوتے دار دشمنوں پر کئے ہیں کہ لوگوں نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبا لیں، اس چھوٹی سی ملازمت میں بارہ تمغے مجھے مل چکے ہیں۔ میں نے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر سراغ رسانی بھی کی ہے۔ اور اگر یہ موذی مرض نہ ہوتا تو اب تک میں بھی سارجنٹ ہوتا مگر اب تو زندگی بے کار ہو گئی۔

ان ذرا ذرا سی باتوں کا پس منظر گھنٹی کی آواز کی طرح بھیانک تھا۔ میں نے گردن گھما کر اسٹریچر گاڑی کی طرف دیکھا جو اپنے مقام پر اسی طرح کھڑی تھی اور ساتھ میں وہ دونوں مورتیاں سفید لباس پہنے اور سروں پر قصابے باندھے ٹہل رہی تھیں

کتنا بہت سا دیر اہوا کریم خاں کے اپریشن میں؟ خون گراتے گراتے مسٹر سین نے اپنے مخصوص بنگالی انداز میں کہا۔

رگھوبیر سنگھ جو ابتک مسٹر سین کا سر بگڑے ہوئے تھا۔ سہم کر بولا۔ بڑا بیڈ ڈھب اپریشن ہے۔ ایشور جانے۔ بچے گا یا نہیں، جوانوں پر موت کا خوف بڈھوں سے زیادہ طاری رہتا ہے۔

اس لئے رگھوبیر سنگھ کی تمام ہمدردیاں کریم خاں کے ساتھ تھیں، وہ جوان تھا اور جوانی بھی بھرپور شباب کی مرض کی نوعیت جو کچھ بھی ہو مگر وہ مرنا نہیں چاہتا تھا دوسرے دن خود اس کا اپریشن تھا اس لئے کریم خاں کے آپریشن سے اُسے ہمدردی تھی۔

میں نے پوچھا شادی ہو چکی ہے؟

جی ہاں،

بچہ؟

ہوا ہوگا۔

شادی اور بچہ کا ذکر کر کے میں نے اُسے تلملا دیا۔ وہ بےچین سا ہو گیا، کہنے لگا میرے باپ دادا بڑے خیرخواہ تھے مگر میرے نزدیک نرے جاہل اور غدار جو مجھے اس آفت میں پھنسا گئے۔ خود تو پچھلی لڑائی میں بھسم ہو گئے اور اب بھوتوں کی شکل

میں میرے اوپر منڈلا رہے ہیں، اتنا کہکر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا، مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے، وہاں کی سندر زندگی آزادی، تندرستی، اور بے فکری، وہ پھر رکا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ سوچتا ہے اسے بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ جس طرح اکثر ہکلے بات کرتے کرتے جوش میں آکر کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں اس نے اپنی ٹانگیں پلنگ سے اتار کر زمین پر گڑا دیں۔

——— میری شادی کی عمر ملازمت کی عمر سے کم ہے، نوکر ہو جانے کے بعد میرا گونا ہوا تھا۔ صرف ایک ہفتہ کے لئے گھر گیا تھا۔ اور بس مگر یار وہ دن یاد آتے ہیں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے، ایسی سندر عورت ملی تھی کہ کیا بتاؤں ———

——— جیسی وہ صبح والی نرس آئی ہے، بالکل وہی۔ ویسا ہی نقشہ، وہی رنگ، البتہ لمبی تڑنگی اس سے زیادہ ہے ——— وہ راستہ دیکھتی ہوگی، اور کون جانے چھنال نے دوسرا خصم کر لیا ہو اگر نہیں کیا ہے تو اب کر لے گی۔ میں بچ ہی کہاں سکتا ہوں۔

اتنے میں مس ولیم ایک ہاتھ میں تھرما میٹر اور دوسرے ہاتھ میں مریضوں کے چارٹ لئے ہوئے داخل ہوئیں ہم لوگ خاموش ہو گئے کیونکہ آداب شفا خانہ اور مریض دونوں کے لئے خاموشی ضروری چیز ہے۔

آتے ہی بولیں، آپ لوگ بہت باتونی ہیں، آرام کرنا تو جانتے ہی نہیں، سارجنٹ صاحب نے ایک دردناک کرب کیساتھ کہا۔ او گاڈ اور مس ولیم آہستہ قدموں کے ساتھ اگلی طرف بڑھیں مسٹر سین قدرتاً بے باک تھے۔ اس لئے جا و بیجا ہر بات میں بول اٹھنا انکی عادت تھی۔ کہنے لگے۔ تازی چوٹ ہے کل تک ٹھیک ہو جائے گی، ذرا سے درد میں گاڈ پکارے جا رہے ہیں؟ یہاں تو دس برس سے کھڑے گڑ رہے ہیں اور گاڈ کا خیال تک نہیں آیا

اتنا کہنے کے بعد انھوں نے ایک قہقہہ بھی لگایا۔

"خاموش" مس ولیم بگڑ گئیں کسی کے رونے پر ہنستا کہاں کا انصاف ہے؟ منہ کھولئے اور انھوں نے مسٹر سین کے منہ میں تھرمامیٹر گھسیڑ کر انھیں خاموش کر دیا۔

اس وقت اسپتال کی چھت پر دو بلیاں آپس میں لڑ کر رونے لگیں، ان کی آوازیں فضا کو چیرتی ہوئی بہت دور تک نکل گئیں، ان بلیوں کے رونے اور مسٹر سین کے ہنسنے کی حدیں بہت قریب قریب تھیں، گویا ہنسی رونے کا عکس ہے۔ ہندوستان میں جب تک کوئی نہ مرے کسی کو رونے کا موقع نہیں ملتا۔ بلیاں اب غرا رہی تھیں، اور مس ولیم تھرمامیٹر نکالنے کے انتظار میں سین کے چہرے کو گھور رہی تھیں۔

میں نے ہر قسم کی شراب پی ہے، دنیا میں جس قدر دیسی اور ولائتی شرابیں موجود ہیں سب میرے حلق کے نیچے اتر چکی ہیں اور ان کی وجہ سے میرے سینے میں بڑے بڑے غار ہو گئے ہیں۔ دنیا میں متوالوں کے عجیب عجیب نام ہیں مثلاً رندمے نوش، شرابی نشہ باز، مگر اسپتال کی دنیا میں ایسے متوالوں کا صرف نام ہے ٹی۔ بی پیشینٹ۔ میں ٹی بی کا مریض ہوں نہ مجھے کسی نے رائفل کا دستہ مارا ہے اور نہ میرے سر پر باکسنگ کے گھونسے پڑے ہیں۔ میری موت اور زندگی دونوں آزاد ہیں نہ کسی وجہ سے زندہ ہوں اور مروں گا تو کوئی وجہ نہ ہوگی۔ میرا مرض مہلک ہی مگر آزاد ہے۔ میں نے خود اسے مول لیا ہے، زبردستی میرے جسم میں ٹھونسا نہیں گیا ہے۔ رگھوبیر سنگھ مسٹر سین اور کریم خاں کیطرح مجھے کسی سے شکایت کرنے کا موقع نہیں ہے میرا خون بدلہ لینے کے لئے نہیں کھولتا۔ میری کھانسی کے ساتھ کلیوں خون آتا ہے میرے سینے میں